فروری ۱۹۶۷ء

جلد ۶۶ عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ سات روپے قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ٦	فروری ۱۹۶۷ء	جلد ٦٦

اشارات — عبدالحمید صدیقی — ۲

تفہیم القرآن :

النجم (۳) — ابوالاعلیٰ مودودی — ۱۷

مقالات :

خطبۂ عید الفطر — " " — ۳۸

مطبوعات — ادارہ — ۷۰

چندہ سالانہ	دفتر ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن - اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

قریب قریب گیارہ کروڑ کی آبادی کا مسلمان ملک گزشتہ سوا سال سے جان و مال کی جس اندوہناک تباہی سے دوچار رہا ہے اس کے حالات پڑھ کر انسان کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ انسانی جان تو خیر بڑی قیمتی ہے کسی انسان کو تو یہ بات بھی زیب نہیں دیتی کہ وہ کسی ذی روح کو ناحق ستائے یا اس پر دستِ ظلم دراز کرے۔ مگر اس بدنصیب ملک، انڈونیشیا کا یہ حال ہوگیا ہے کہ بھائی بھائی کا دمساز بننے کے بجائے اُس کے خون کا پیاسا بنا ہوا ہے، اُس کی جان و مال کی حفاظت کرنے کے بجائے اسے غارت اور برباد کرنے میں منہمک ہے۔ املاک کا جو اتلاف ہوا ہے اس کا تو کوئی صحیح حساب نہیں لگایا جا سکتا۔ البتہ اس انقلاب میں تقریباً دس لاکھ قیمتی جانیں ضائع ہوئی ہیں اور یہ وہ جانیں ہیں جن کے بارے میں ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے تاریخی موقع پر بڑی تاکید کے ساتھ یہ فرمایا تھا:

ان دماءکم واموالکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا فی بلدکم هذا الی یوم تلقون ربکم۔

تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح تم پر حرام ہے جس طرح یہ دن، اس مہینہ میں اور اس شہر (مکہ) میں حرام ہے۔

ذہن میں بار بار یہ سوال اُبھر کر آتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ آناً فاناً نیلے آسمان سے ٹوٹ پڑنے والی بجلی کی طرح ہوا ہے یا انڈونیشیا کے سیاسی افق پر ایسے تاریک بادل آہستہ آہستہ جمع ہو رہے تھے جو ایک خوفناک طوفان کے آنے کی خبر دے رہے تھے اور پوری گھن گرج کے ساتھ اس بات کی دہائی دے رہے تھے کہ اُن کی آستینوں سے نہایت خوفناک قسم کی بجلیاں گرنے والی ہیں۔ انڈونیشیا میں جو کچھ ہوا ہے

وہ فی الحقیقت بڑا کربناک بلکہ اذیت ناک ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سب کچھ دفعتاً نہیں ہُوا بلکہ اصحابِ اقتدار کی پے در پے غلط کاریوں نے آہستہ آہستہ پوری قوم کو دھکیل کر ایک نہایت خطرناک غار کے دہانے پر لاکھڑا کیا جہاں سے وہ لڑھک کر بربادی کے آغوش میں پہنچ گئی۔ ایک عظیم الشان قوم پر جس نے پورے اتحاد اور اتفاق کے ساتھ ولندیزی سامراجیت کو شکست فاش دے کر ابھی چند سال پیشتر آزادی حاصل کی تھی اچانک کسی پاگل پن کا دَورہ تو نہیں پڑا کہ اُس نے اپنے فرزندوں اور جاں نثاروں کو ہی کھانا شروع کر دیا ہو۔ وہ اگر فی الواقع اس وقت دیوانوں کی سی حرکات کر رہی ہے اور اُس پر واقعی دیوانگی کا عالم طاری ہے تو یہ سب کچھ یونہی کسی وقتی ترنگ میں نہیں ہو گیا بلکہ یہ ایک طویل کرب اور اذیت کا نتیجہ ہے جس نے اُس کے ذہن کو مفلوج کر کے اُسے درندوں کی سی روش اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔

یہ ذہنی کرب و اضطراب جس نے انڈونیشی قوم کے ذہنی توازن کو بگاڑ کر اُسے خود اپنی بربادی پر آمادہ کیا ہے، صرف اسی قوم تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی ٹیسیں آج پوری دنیائے اسلام میں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہیں۔ مسلمانوں کا کوئی ایسا خطہ نہیں ہے جس میں یہی اذیت ناک صورتِ حال موجود نہ ہو۔ کہیں یہ واقعتاً لوگوں کو دیوانہ بنا کر انہیں ایک نہایت خطرناک روش پر ڈال چکی ہے، اور کہیں یہ زہر ذہنوں کے اندر آہستہ آہستہ سرایت کر کے اُنہیں مفلوج کر رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ دوسرے مسلمان ممالک بھی اس مصیبت سے دوچار ہوں لیکن دنیائے اسلام کے حالات جس تشویشناک رُخ پر جا رہے ہیں۔ انہیں دیکھنے سے یہ چیز کوئی اَنہونی اور غیر متوقع نظر نہیں آتی۔ اسی لیے ضرورت ہے کہ ہم انڈونیشیا کے حالات کو سمجھیں اور ان سے سبق لیں۔

مسلمان عیسائیوں کے بعد تعداد کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی قوم ہیں۔ اس کرۂ ارضی کے ایک بہت بڑے حصے پر ان کا قبضہ ہے۔ پھر یورپ کے صنعتی انقلاب سے پہلے یہ قوم اقوامِ عالم میں ایک

ممتاز حیثیت کی مالک رہی ہے۔ اُس کی یہ برتری جو زندگی کے کسی ایک شعبے میں نہیں بلکہ سارے شعبوں میں تھی، پُورے ایک ہزار سال تک قائم رہی۔ اس قوم کا اپنا ایک مخصوص نظریۂ حیات ہے۔ اس کا اپنا ایک متعین اور واضح اُسلوب زندگی ہے۔ اس کی اپنی کچھ مخصوص روایات ہیں۔ اس کا اپنا ایک درخشاں ماضی ہے۔ اس قوم نے نہ صرف ایک لمبے عرصے تک خوب و ناخوب کے اپنے معیاروں کے ساتھ اپنے آپ کو زندہ رکھا بلکہ پُوری انسانیت کو اُن سے متاثر کیا اور نہ صرف اس کے فکر و احساس کی صورت گری کی، بلکہ اُسے سیاست، معیشت، معاشرت اور مذہب کی نئی قدروں سے نوازا۔ ہمیں اس وقت اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ اس قوم کی ان قدروں کی نوعیت کیا تھی اور انھوں نے انسانیت پر کیا اثرات مرتب کیے، بلکہ اس جگہ ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ قوم جو فکر و احساس کے اپنے خاص زاویے رکھتی ہو اور اُن کے مطابق جس نے آٹھ نو سو سال خود بھی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی ہو اور دوسری قوموں کے زاویے بدلنے کے لیے بھی ہمت آزما رہی ہو اُس کی حیثیت اُس پرکاہ کے برابر نہیں ہوتی جسے سیاسی طوفان یا فوجِ سیاہ کے ریلے جس طرف چاہیں بہا کر لے جائیں۔ اِس قوم کو اندر سے بدل ڈالنا اور دنیا سے بھی اس کے اثرات کو مٹا دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کی حیثیت کو ختم کرنے کے لیے بڑی طویل جد وجہد درکار ہے۔

مسلمان قوم جب اپنے اصل مقصد کو، جو اس کی قوت و حرارت کا سرچشمہ تھا، بھول کر اضمحلال کا شکار ہوگئی تو مغرب کی استعمار پسند قوموں نے اس پر قبضہ کرکے اسے لوٹنا شروع کیا۔ ابھی اس استحصال کو دو صدیاں بھی گزرنے نہ پائی تھیں کہ خود ان مغربی قوموں میں یکے بعد دیگرے دو عالمگیر جنگیں ہوئیں جنھوں نے انھیں اتنا کمزور کر دیا کہ اب ان کے لیے اسلحہ و بارود کے ساتھ مسلمانوں پر مسلط رہنا قریب قریب ناممکن ہوگیا۔ لیکن ان کے منہ کو اس مظلوم قوم کے خون کی جو چاٹ لگی ہوئی تھی وہ انھیں برابر کوئی ایسی تدبیر کرنے پر اُبھار رہی تھی جس سے سیاسی گرفت کے نہ ہونے کے باوجود وہ انھیں بندۂ بے دام بنائے رکھیں۔ اس کے لیے بڑے غور و خوض کے بعد مغربی سامراج اس نتیجے پر پہنچا کہ اس قوم سے تیر و تفنگ یا سیاسی اقتدار کا چھین لینا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ ایمان کا سلب کر لینا ضروری ہے، کیونکہ جب تک اس کے اندر ایمان کی چنگاری

موجود ہے یہ راکھ کا ڈھیر نہیں بن سکتی کہ جس کے ذرات کو دوسری قومیں جس طرح چاہیں منتشر کر سکیں ۔ پھر اس ایمان کے ساتھ وہ کسی باطل نظریہ حیات کو آسانی سے اپنانے پر آمادہ بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس قوم کے ایمان میں اپنی دنیا الگ بسانے اور باطل کو جلا کر خاکستر کرنے کا ولولہ موجود ہے ۔ چنانچہ اس قوم کو متاعِ ایمان سے محروم کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ سامراج نے رخصت ہونے سے کافی مدت پہلے ایک ایسا طبقہ تیار کیا جو اس قوم کی آرزوؤں اور امنگوں کا ترجمان ہونے کے بجائے مغربی افکار و نظریات کا پرستار ہو ۔ اور رختِ سفر باندھنے سے پہلے اقتدار و اختیار کی باگیں اس طبقے کے ہاتھ میں دے کر وہ اس اطمینان کے ساتھ رخصت ہوا کہ یہ طبقہ اس کی عدم موجودگی میں وہ سارے کام بطریقِ احسن انجام دیگا جو مغربی سامراج اپنے دورِ اقتدار میں کرتا رہا ہے ۔

ادھر یہ مغرب پرست طبقہ اپنے اپنے ملک میں مغربی آقاؤں کی خواہش اور تمنا کے مطابق اس قوم کو دین سے دور لے جانے کی کوشش میں منہمک ہوا ، اور دوسری طرف قوم کے اندر یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ ابھرنے لگا کہ اب آزاد ہونے کے بعد بھی اگر اُسے متاعِ آزادی سے محروم ہی رہنا ہے اور اسے اپنی دنیا غیروں کے نقشے کے مطابق ہی تعمیر کرنی ہے تو پھر حصولِ آزادی کے لیے جان و مال کی اتنی بے پناہ قربانیوں کی ضرورت ہی کیا تھی ۔ اگر استعمار کی جونک کو اس کا خون پہلے کی طرح ہی چوسنا ہے اور اُسے اغیار کے بتائے ہوئے راستے پر بالکل بے بس ہو کر ہی چلنا ہے تو پھر یہ تو سراسر خسارے کا سودا ہے ۔ کیونکہ بدیشی آقا طاقتور اور ترقی یافتہ قوم سے تعلق رکھنے کی وجہ سے زیادہ مستعد ، ذہین اور فرض شناس تھے اور اس بنا پر ان دیسی آقاؤں کی بہ نسبت اُس کے جان و مال کی بہتر طور پر حفاظت کر سکتے تھے ۔ لہٰذا آزادی کے بعد اگر ہماری قسمت نہیں بدلنی تو پھر اس نام نہاد آزادی کے لیے ساری جدوجہد اور قربانی بالکل بے مقصد اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے ۔

محرومی اور ناکامی کے اس احساس نے قوم کے اندر دو طبقوں کو جنم دیا ۔ ایک طبقہ تو وہ تھا جس نے

یہ محسوس کیا کہ اُس نے جنگِ آزادی میں شریک ہو کر غلطی کی ہے۔ یہ قوم ابھی آزادی کے لیے ذہنی اور اخلاقی طور پر تیار نہ تھی اور اسے قبل از وقت آزادی مل گئی اور اس احساس کے ساتھ ہی وہ ہمت ہار کر بیٹھ گیا۔ اس طبقے کے نقطۂ نظر میں بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ یہ نہیں سوچتا کہ وہ جس چیز کو آزادی کی صلاحیت اور اہلیت قرار دے رہا ہے وہ سامراج اپنے دورِ اقتدار میں کس طرح پیدا ہونے دے سکتا تھا۔ اس کی تو کوشش ہی یہی تھی کہ ان لوگوں کے اندر یہ صلاحیت کسی طرح بھی اُبھرنے نہ پائے۔

دوسرے طبقے نے جسے عوامی تائید حاصل تھی، ملکی معاملات پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ آزادی کے بعد ملت کی ان خواہشات اور تمناؤں کو پورا کیا جائے جن کے لیے ہی دراصل آزادی کی جدوجہد کی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں قریب قریب ہر جگہ اس حکمران طبقے کے ساتھ اس کی کشمکش شروع ہو گئی جس کے پاس لشکر و سپاہ کی بہت بڑی تعداد ہے، جس کے قبضے میں پورے پورے ملکوں کے وسائل ہیں، اور جس نے خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں کا ایک وسیع حلقہ بھی قائم کر رکھا ہے۔ یہ کشمکش کہیں تو جذبات کی تلخیوں کی شکل اختیار کر رہی ہے، کہیں اس سے فکری اور ذہنی انتشار رونما ہو رہا ہے۔ —— —— کہیں اس نے حاکم و محکوم کے درمیان بُعد و بیگانگی کی صورت اختیار کر لی ہے، اور کہیں اس نے اپنے ہی بھائی بندوں کے درمیان قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا ہے انڈونیشیا میں جو کچھ ہوا ہے یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ اس پورے المیے کے پیچھے ایک طویل کشمکش ہے جو بدقسمتی سے سارے اسلامی ممالک میں اس وقت برپا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور یہ کشمکش وہاں کسی نہ کسی صورت میں موجود نہ ہو۔ اس بنا پر انڈونیشیا میں کوئی ایسی چیز واقع نہیں ہوئی جس سے دوسرے اسلامی ممالک بالکل محفوظ و مامون ہوں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس ابتلا سے بچائے اور اپنی رحمتِ خاص سے معاونت اور دستگیری کرکے انہیں اس شر سے نکال لے۔ لیکن جہاں تک حالات کے بہاؤ کا تعلق ہے اُسے دیکھنے سے مستقبل کی بڑی بھیانک تصویر سامنے آتی ہے۔

یہ تو ہے دنیائے اسلام میں اس کشمکش کا داخلی پس منظر۔ اس کے خارجی حالات میں ایک نمایاں

تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ مغرب نے اسلام کے خلاف سازش کا جو منصوبہ بنایا تھا اب اس میں مشرق کی اشتراکیت بھی ایک نمایاں حیثیت سے شامل ہو گئی ہے، اور مغربی استعمار اس سے خوش ہے کہ اسلام اگر اشتراکیت کی چھُری سے ذبح ہو سکتا ہو تو اسی سے ذبح ہو جائے۔ اس نئے عنصر کی آمد کے چند وجوہ ہیں:

(۱) مغرب کا سرمایہ داری نظام اور اس کے ساتھ وابستہ تہذیب، دونوں خود ہی اضمحلال کا شکار ہیں اُس کی غیر متوازن معاشی ترقی نے اُسے مجبور کر دیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک اشتراکیت کے اصولوں کو اپنائے۔ چنانچہ آج دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں اشتراکیت کسی نہ کسی صورت میں موجود نہ ہو۔

(۲) مسلمانوں کے دلوں میں بعض تاریخی اسباب کی بنا پر جس سامراج کے خلاف سخت حقارت اور نفرت کا جذبہ موجود ہے وہ ایسی سامراجیت ہے جس کے ساتھ مسیحیت بھی آئی تھی۔ چنانچہ اُن کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ سامراج وہی زیادہ قابلِ نفرت ہے جو صلیب کا نشان لیے ہوئے آئے۔ اس لیے اب یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں پر غیر اسلامی نظریات کو مسلّط کرنا اشتراکیت کے ذریعہ سے نسبتاً زیادہ آسان ہے جس کے ساتھ کوئی مذہبی نشان لگا ہوا نہیں ہے۔

(۳) مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام کسی تحریک کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ اس پر انحطاط کا عالم طاری ہے اور اس میں اب یہ خوبو نہیں رہی کہ دنیا کی کوئی قوم اسے ایک نصب العین کی حیثیت سے اپنا کر اپنی عملی جدوجہد کے لیے اس سے حرکت اور حرارت حاصل کرے۔ یہ نظام اب محض زندہ ہے۔ اس میں لوگوں کے قلب و دماغ کو مسخر کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ اس کے مقابلے میں اشتراکیت ابھی ایک زبردست قوتِ فکر و عمل ہے۔ یورپ میں رُوس نے اور ایشیا میں چین نے اسے اپنا کر مختصر سی مدت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ یہاں کے عوام خصوصاً چینی عوام میں توسیع کا زبردست ولولہ موجود ہے۔ اس لیے اس نظام میں لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کی ابھی چمک دمک باقی ہے۔

(۴) مغربی سرمایہ داری نے جس اصول کو اپنا کر ترقی کی تھی اس کی بنیاد عدمِ مداخلت LAISSEZ FARE پر تھی۔ اسی بنا پر وہاں آزاد معیشت کے ساتھ جو سیاسی نظام پروان چڑھا وہ جمہوریت اور آزادیٔ رائے ہے۔ لیکن تجربہ نے اہلِ مغرب پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ کوئی جمہوری نظام جس میں آزادیٔ اظہارِ رائے ہو اور جس میں حکومتوں کا بننا اور بدلنا عوام کی رائے پر موقوف ہو، اُن کے مقاصد کے لیے مسلمان ممالک میں کسی طرح بھی مفید اور کارآمد نہیں ہے کیونکہ مسلمان عوام نہ تو اپنی مرضی سے اپنی روایات کو ترک کرنے پر تیار ہوتے ہیں اور نہ مذہب کو تیاگ دینے ہی پر آمادہ ہو سکتے ہیں، بلکہ ان "جاہلوں" کو جب بھی اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملتا ہے تو لاکھ عقل کرنے کے باوجود وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم اسلامی نظامِ حیات ہی میں اپنی فلاح و کامرانی کا خواب دیکھتے ہیں۔ اس لیے آزادی و جمہوریت اس قوم کے لیے کسی جہت سے بھی موزوں نہیں ہے۔ انہیں "راہِ راست" پر لانے کے لیے کوئی ایسا نظام درکار ہے جو انہیں بالجبر غیر اسلامی اقدار کا فدائی اور پرستار بنا دے اور قوت کے زور سے ان کے اندر اسلام کے سارے نقوش مٹا ڈالے۔ یہ مہم اشتراکیت کے ذریعہ سے زیادہ اچھی طرح سر ہو سکتی ہے۔

(۵) اشتراکی نظام ڈکٹیٹروں کو بھی زیادہ اپیل کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے انہیں ایک ملک کے تمام وسائلِ رزق پر کنٹرول حاصل ہو جاتا ہے اور پوری قوم ان کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہو جاتی ہے۔ وہ اشتراکیت کے اس جز کو تو پسند نہیں کرتے کہ حکومت لوگوں کو روزی مہیا کرنے کا ذمہ لے، مگر اس کا یہ جز انہیں بہت پسند آتا ہے کہ تمام ذرائع پیداوار پر حکومت کا قبضہ ہو جائے۔

(۶) اسے ہماری قومی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ خود مسلمانوں کے اندر ماضی اور حال میں بعض ایسے خود غرض اور دنیا پرست اصحابِ اقتدار پیدا ہوئے جنہوں نے اسلام کے مقدس نام پر اس ملت کے ساتھ بڑا شرمناک کھیل کھیلا اور اللہ کے دین کو محض ناجائز استحصال کا ذریعہ بنایا۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے اندر فی الحقیقت ایک ذہنی طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جو اگرچہ اسلام کی صداقت کا قائل ہے لیکن اس امر سے بہرحال مایوس ہو چکا ہے کہ اب یہ کبھی دنیا کی رہنما قوت بھی بن سکتا ہے۔ پھر چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل پر علماء کے جھگڑوں نے ان کو مذہب سے اور بھی بیگانہ کر دیا ہے۔ اس لیے وہ اب مسلمان

قوم کی نجات اسی میں سمجھتا ہے کہ کوئی ایسی تحریک اپنا لی جائے جس میں اس مقدس نام پر لوٹ کھسوٹ کی سرے سے گنجائش ہی نہ ہو اور جو لوگ اس کی آڑ میں سادہ لوح عوام کو لوٹ رہے ہیں، اُن کا یکسر خاتمہ ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے ان کی نظر میں اگر کوئی تحریک جچتی ہے تو وہ سرمایہ داری نہیں بلکہ اشتراکیت ہے۔

اشتراکیت، سرمایہ داری کی بہ نسبت مسلمانوں کو ایمان سے محروم کرنے کے لیے کتنی مفید ہے، اور اگر انہیں غیر اسلامی اقدار کا پرستار بنانا مطلوب ہو تو اس مقصد کے لیے وہ کس قدر ناگزیر ہے، اس کے متعلق ایک محقق مسٹر سنیائے کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں۔ مسلم قوم کے ہر فرد کو ان پر پوری سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے:

"بدقسمتی سے جمہوریت ہر زہر کا تریاق نہیں اور یہ ہر قسم کے حالات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ انسانی ترقی کی بعض منازل میں ایک ایسی زبردست آمریت درکار ہوتی ہے جو ماضی کے ملبے کو پوری طرح ہٹا کر زمین ہموار کر دے اور جبر کے ساتھ جاہل اور تنگ نظر عوام کو ضروری تبدیلیاں قبول کرنے پر مجبور کر دے ... اس کے لیے ایک نئی قیادت درکار ہے ... ایسی قیادت جو سخت گیر اور جابر ہو اور جمہوری طریقوں سے حکمرانی کرنے کا برملا انکار کر دے۔ اُس قیادت کے سامنے ہمیشہ دو مقاصد ہونے چاہییں۔ ایک یہ کہ پورا سماج یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ قوم کو ڈسپلن اور ضبط کے آہنی شکنجوں میں جکڑ کر رکھا جائے۔ اس نئی قیادت کا یہ عین فرض ہے کہ وہ ایک ہی دار میں قوم کا ماضی سے رشتہ کاٹ کر اُسے نئی عادات اور نئی اقدار کا پابند بنائے۔ اس کے لیے اُسے اگر کلیت پسند ریاست نہیں تو کم از کم آمرانہ اختیارات کی حکومت تشکیل کرنا چاہیے۔ جو نہ صرف سابق نظام کے آخری نشان کو بڑی جرأت کے ساتھ مٹا دے بلکہ عوام کی موجود روش میں بھی تبدیلی پیدا کرے اور اُن کے نظام عقائد، اُن کے رسوم اور اُن کے اعمال کا بڑی سختی سے محاسبہ کرے۔ اس راہ میں اُسے فرد کے حقوق اور اسی نوعیت کے دوسرے تحفظات یا کسی طبقے

کے مفادات کو قطعاً حائل نہ ہونے دینا چاہیے۔ اس قیادت کو سنگلاخ زمین کی طرح مضبوط اور سخت ہو کر حکومت کی زمام کار سنبھالنے کے لیے منظم ہونا چاہیے اور قوم کو ایک ایسے نئے اور حرکت آفرین تصورِ حیات کا پرستار بنانا چاہیے جو مذہب اور اُس کی روایات کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کر دے۔"

اہلِ مغرب مشرقی ممالک کے لیے اصلاح کا جو پروگرام رکھتے ہیں اور اُسے عملی جامہ پہنانے کے لیے جس قسم کی قیادت کو جس فکر و نظر اور جذبہ وعمل کی جن صلاحیتوں کے ساتھ اُبھارنا چاہتے ہیں، اس کا تذکرہ تو آپ نے سُن لیا۔ اب ذرا یہ بھی دیکھیے کہ اس مصنف کے نزدیک ان اغراض کے لیے اشتراکیت کیسی غیر معمولی افادیت کی حامل ہے:

"اشتراکیت اس بیسویں صدی میں سرمایہ دارانہ انقلابات کا نہایت عمدہ اور مؤثر بدل ہے۔ ایسے معاشرے جو بعض روایات کے پابند تھے اور جنہوں نے ان انقلابات کو ناکام بنا دیا، اُن میں اشتراکیت کو حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی۔ مانا کہ یہ نظام ظالمانہ، اور کلیت پسندانہ ہے اور اس کی جکڑبندیاں بڑی سخت ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ کسی پس ماندہ معاشرے میں صنعتی انقلاب کے لیے یا اُسے معاشی اور تعلیمی اعتبار سے "جدید" بنانے یا دوسرے لفظوں میں مغربی افکار و نظریات اور مغربی روایات کا علمبردار بنانے کے لیے اشتراکیت سے زیادہ مؤثر اور کارگر کوئی دوسرا حربہ نہیں ہو سکتا۔ پھر چونکہ اس نظام میں کسی قوم کے اپنے مخصوص ماحول کی روایات کو جو اُس کے اندر پوری طرح رچی بسی ہوں، بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کی غیر معمولی قوت ہے، اس لیے اس نے صنعتی سماج کی تعمیرِ نو میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس میں لامحدود قوت کے علاوہ پوری قوم کو کام پر لگانے، معاشرے کو زیر و زبر کرنے اور اس راہ میں جو حائل ہو اُسے بے پناہ جبر و استبداد کے ساتھ ہٹا دینے اور اس جد و جہد میں پوری بے حسی کے ساتھ عوام پر دستِ ظلم دراز کرنے اور اس کے نتیجے میں ان کے مصائب کو بالکل بے پروائی کے ساتھ دیکھنے

کی بھی غیر معمولی طاقت ہے۔

اشتراکیت نے اپنے اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے لیے ریاستی سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کا طبقہ پیدا کیا ہے جو مغربی طرزِ فکر کے مطابق نئی صنعتی معیشت کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور اس طبقے کی دریافت یا تشکیل اشتراکیت کی نمایاں کامیابی ہے ... یہ نیا طبقہ انیسویں صدی کے پرانے سرمایہ داروں کی جگہ جدید، ظالم، زیادہ طاقتور اور با اختیار سرمایہ داروں کا ایک ایسا مضبوط طبقہ ہے جو ہر نقشِ کہن کو مٹا کر نئی دنیا تعمیر کرتا ہے ... اشتراکیت کے مقاصد در طریقِ کار میں بڑا تناقض اور تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ ظلم و استبداد کا ظالمانہ ہتھکنڈوں کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ یہ ایک طرف لوگوں کو پرانے اوہام اور روایات سے نجات دلاتا ہے اور دوسری طرف انہیں پوری مذہبی تنگ نظری اور پورے تعصب کے ساتھ ایک نئے تصورِ حیات کو اپنانے پر مجبور کرتا ہے۔ نیز انہیں سیاسی آمریت اور مطلق العنانیت کا خوگر بھی بناتا ہے۔ یہ قوموں کا رشتہ دنیائے مغرب سے توڑتا ہے لیکن انہیں آخر کار اسی کا پیرو اور مقلد بنانے کے لیے بھرپور کوشش کرتا ہے۔ یہ مغرب کے خلاف پورے زور کے ساتھ جنگ کا اعلان کرتا ہے لیکن انہیں بہر حال اسی کی نقالی کی دعوت دیتا ہے اور انہیں وہی روش اختیار کرنے پر ابھارتا ہے جس پر مغربی اقوام اس وقت گامزن ہیں[1]۔"

اہلِ مغرب کے خطرناک عزائم، ان کی تکمیل کے لیے اشتراکیت کی غیر معمولی افادیت، اور مسلمان قوم کے مزاج اور اس کے ذہنی اور جذباتی پس منظر کو سامنے رکھ کر انڈونیشیا کے حالات پر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس مسلمان ملک میں جو کچھ ہوا ہے وہ طویل سازش کی محض ایک کڑی ہے، اور آج پوری دنیائے اسلام میں جو اضطراب بے چینی بلکہ کشمکش پائی جاتی ہے وہ اسلام کے خلاف مغربی حکمتِ عملی کا ایک نتیجہ ہے۔

پھر انڈونیشیا کے حالات دیکھ کر یہ حقیقت بھی پوری طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مغرب کے ارادے ناپاک ہی نہیں سنگین کی نوعیت مجرد معاشی استحصال سے بدل کر نظریاتی اور تہذیبی استحصال کی بن گئی ہے۔ پوری دو صدیوں

---

[1] A CHALLENGE TO MODERNISATION P. 217-223

کے سیاسی اور معاشی نفوذ کے بعد دنیا نے جو رُخ اختیار کیا ہے اُس میں نیشنلزم کے بل بوتے پر کسی قوم کا زندہ رہنا قریب قریب ناممکن ہوگیا ہے۔ اب اگر دنیا میں کسی قوم کو عزت کے ساتھ جینا ہے تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ اُس کا تصورِ حیات، اس کی تہذیب، اس کا تمدن دنیا میں غالب ہو اور اُس کے مقابلے میں جتنے افکار و نظریات اور جتنے دوسرے نظامہائے زندگی ہوں وہ بالکل مغلوب و مفلوج ہوں۔ ان بدلے ہوئے حالات میں اب کسی قوم میں سے محض کرائے کے ایجنٹ تلاش کرکے کوئی طاقتور قوم یا غالب تہذیب اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی جن قوموں کو اب مٹانا مقصود ہے سب سے پہلے اُن کے تصورِ حیات پر کاری ضرب لگانا ناگزیر ہے تاکہ وہ اپنے نظریۂ حیات کے مطابق نہیں بلکہ غالب قوم کے تصورِ زیست کے مطابق زندگی گزاریں۔ ظاہر بات ہے کہ فکر و نظر کا یہ انقلاب اُن لوگوں کے ہاتھوں تو برپا نہیں کیا جاسکتا جو غیر ملکی سامراج کے آلۂ کار ہونے کی وجہ سے اپنی قوم میں کسی عزت اور وقار کے مستحق نہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے سیاسی تجربہ کے مطابق ایک ایسی قیادت کو جنم دینا ضروری ہے جو رہنمائی کی پوری پوری صلاحیتیں رکھتی ہو، قوم کو بھی اس کے خلوص اور قوتِ عمل پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ ہو، اور وہ غیر ملکی ایجنٹ کی حیثیت سے نہیں بلکہ قوم کی سچی غم خوار اور مخلص و دمساز بن کر اُس کے فکر و نظر کے زاویوں کو اہلِ مغرب کی خواہش کے مطابق بدل دے۔ مغربی قومیں مسلمان ممالک کی قیادتوں سے یہ کام اتنی گہری سازش اور عیاری سے لے رہی ہیں کہ انہیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ قوم کی محبت اور اُس کی غربت اور افلاس کے غم میں کر رہی ہیں درحقیقت وہ قوم کی فلاح نہیں بلکہ بربادی ہے اور وہ بالکل نادانستہ طور پر مغرب کے ناپاک مقاصد کی تکمیل میں بطور آلۂ کار استعمال ہو رہی ہیں۔

آئیے اب انڈونیشیا کے انقلاب کے آئینہ میں مغرب کی ان ہی حکمتِ عملیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

مسلم قوم کا یہ ایک وسیع و عریض ملک تین سو سال تک ولندیزی سامراجیت کا شکار رہنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں آزاد ہوا۔ آزادی کی جدوجہد میں اگرچہ مختلف افراد اور جماعتیں شریک ہوئیں مگر اس کے محرکات میں صرف ایک ہی محرک کارفرما تھا کہ اس قوم کی اجتماعی زندگی کی تشکیل اُس نقشے کے مطابق نہیں جو اُسے اسلام سے ملا ہے۔ جب تک آزادی کی جنگ جاری رہی تعمیرِ نو کے بارے میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہوا۔ عوام نے جہاد کے مقدس جذبے

کے ساتھ جان و مال کا ایثار کیا اور طویل کشمکش کے بعد ملک کو ولندیزی چنگل سے آزاد کرا لیا۔ اس جنگ میں ایک دین پسند جماعت یعنی ماشومی پارٹی نے بڑی قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں، البتہ قیادت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں رہی، جو اگرچہ دین کا مخالف اور دشمن نہ تھا مگر اسلامی اخلاق اور اسلامی ضابطۂ حیات کا کوئی اچھا نمونہ بھی نہ تھا۔ اس شخص کو بہر حال جدوجہد کے اس دور میں اس لیے گوارا کیا گیا کہ آزادیٔ وطن کی تحریک کا یہ نہ صرف ایک آزمودہ کار اور مخلص کارکن تھا بلکہ سامراج کے جوڑ توڑ اور سازشوں سے پوری طرح واقف ہونے کی وجہ سے اس کا جم کر مقابلہ کر سکتا تھا۔

آزاد ہونے کے بعد جب ملک کی تعمیرِ نو کا مسئلہ پیش آیا تو پوری قوم نے یہ محسوس کیا کہ سکارنو کی قیادت میں ملک چاہے اور کچھ بن جائے تو بن جائے مگر اسلامی نہیں بن سکتا۔ دوسری طرف اس قائد نے بھی حالات کا پوری طرح اندازہ کرتے ہوئے یہ اچھی طرح سمجھ لیا کہ اسلام انسان پر جس قسم کی حدود و قیود عائد کرتا ہے اور انسانی خواہشات پر جس نوعیت کی پابندیاں لگاتا ہے اُس کا مزاج اور اُس کی طبعی افتاد اُن کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ پھر اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایک پسماندہ انحطاط پذیر ملک میں اسلامی نظام کا قیام اُس کے بس کا روگ نہیں۔ اِن وجوہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اُس کے لیے دو ہی راستے ہیں، یا تو وہ خود تختِ اقتدار سے ہٹ کر اُن لوگوں کے لیے جگہ خالی کر دے جو قوم کو انفرادی اور اجتماعی طور پر صحیح معنوں میں مسلمان بنانے کی اہلیت رکھتے ہوں، یا اگر اُسے اقتدار عزیز ہے تو پھر اُسے قوم کو اسلام کی جگہ ایک نیا فلسفۂ حیات اور نیا نصب العین دینا چاہیے اور آہستہ آہستہ اُس کے قلب و دماغ میں سے اسلام کی محبت مٹا کر اُس کی جگہ اپنے دل پسند نظریات کو قبول کرنے کی امنگ پیدا کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے سیکولر ذہن کا اختراع کیا ہوا ایک نیا دین "پنج شیلا" وضع کیا گیا۔ یہ دین پانچ اصولوں پر قائم تھا۔ ایک خدا کا اقرار، دوسرے قوم پرستی، تیسرے جمہوریت، چوتھے انسان دوستی، اور پانچویں معاشرتی انصاف۔ اس نئے دین کی اساس پر انڈونیشیا کے عارضی دستور کی بنیاد رکھی گئی۔

سکارنو کے مالک الملک اور خالقِ کائنات کے بارے میں کیا تصورات تھے، اِس کا اندازہ اُس تقریر سے لگایا جا سکتا ہے جو اُس نے قصرِ جمہوریہ میں دفاعِ پنج شیلا کونسل کے سامنے، ۱۷ جولائی ۱۹۵۴ء کو کی اور جسے وزارت اطلاعات نے بڑے اہتمام سے طبع اور شائع کیا۔ اس تقریر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"میں سرزمینِ انڈونیشیا کا ایک کسان ہوں۔ اِس میدان میں سب سے پہلے مَیں نے جس کا مشاہدہ کیا وہ مذہبی اسپرٹ ہے، کیونکہ انڈونیشی قوم زراعت پر گزر بسر کرتی ہے اور جو قوم زراعت پر گزر بسر کرتی ہو وہ لازماً مذہب پرست ہو گی۔ مَیں نے ابھی اقرارِ خدا کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ مذہبی اسپرٹ کہا ہے جس سے میری مراد غیبی قوتوں کے وجود کا عقیدہ ہے جو ہماری زندگی پر کارفرما ہیں۔ اس عقیدے کا احساس ہم اُس قوم کے اندر پُوری شدّت سے پاتے ہیں جو زراعت پر گزر اوقات کرے۔ یہ ہے بھی درست۔ کاشتکار شخص اپنے دل کی گہرائیوں کے اندر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس دنیا میں ایک غیبی قوت موجود ہے جس پر اس کی تمام محنتوں اور مشقتوں کا دارومدار ہے۔ مثلاً کاشتکار بارش کا آرزو مند ہوتا ہے۔ اس آرزو کو پُورا کرنے کی وہ کس سے درخواست کرے؟"

یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ سکارنو کی اس تقریر کا پُورا اقتباس نقل کیا جائے۔ شائقین حضرات اسے جناب خلیل حامدی صاحب کی تصنیف "نظام اسلامی مشاہیر اسلام کی نظر میں" کے اندر خود دیکھ سکتے ہیں۔ محوّلہ بالا عبارت پڑھنے سے اس امر کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سکارنو صاحب خدا کے بارے میں وہی باطل اوہام رکھتے ہیں جو مغرب کے ملحدانہ فلسفے کی پیداوار ہیں۔ اس معاملے میں اشتراکی ملاحدہ اور غیر اشتراکی ملاحدہ میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں۔ یہ سارے حضرات باری تعالیٰ کو محض ایک واہمہ خیال کرتے ہیں جسے انسان کی بے بسی اور مجبوری اُس کے قلب و دماغ میں جنم دیتی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ انسان کے ذہن میں سے جب ظلمت و تاریکی دُور ہو گی، اور وہ کائنات میں علّت و معلول کی کڑیوں کو سمجھنے لگے گا، اور بے بسی اور بے چارگی کے عالم سے نکل کر کائنات میں تصرف کرنے کی قدرت اپنے اندر پیدا کر لے گا تو وہ خدا سے بے نیاز ہو جائے گا۔ اسی تاریکی اور ظلمت کو یہ شخص مذہبی اسپرٹ کہہ رہا ہے۔ سکارنو کے نزدیک باری تعالیٰ کوئی مستقل قائم بالذات ازلی وابدی

اور با اختیار مبنی نہیں بلکہ سراسر ایک اضافی اور عارضی واہمہ ہے جو معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ زرعی دور میں ایک نوعیت کا خدا ہوتا ہے، اور معاشرہ جب اس دور سے ترقی کر کے صنعتی دور میں داخل ہوتا ہے تو خدا کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے، آخر کار تسخیرِ کائنات کے بعد اس کی قطعاً کوئی ضرورت اور حاجت باقی نہیں رہتی۔

ماشومی پارٹی کے ایک متقدر رہنما اور اسلام کے ایک عظیم فدائی جناب ڈاکٹر محمد ناصر نے، جو جنگِ آزادی میں سکارنو کے ہم رکاب تھے مجلس دستور ساز میں اسلامی دستور کی حمایت کرتے ہوئے سوکارنو کے اس نظریہ پر زبردست گرفت کی اور کہا:

"اِس کی اساس وحی سے ماخوذ نہیں بلکہ یہ محض انسانی غور و فکر کا ثمرہ ہے۔ پھر اس کے اندر نہ تو حاکمیتِ الٰہی کا اعتراف پایا جاتا ہے اور نہ اُن ذمہ داریوں کا کوئی تصور موجود ہے جو حاکمیتِ الٰہی کے اقرار کے بعد حاکم اعلیٰ کی اطاعت کے سلسلے میں وارد ہوتی ہیں۔ اقرارِ خدا کا یہ نظریہ اس سے زائد کچھ نہیں ہے کہ اس میں خدا کے وجود کا ایک مجرد تصور موجود ہے جس کے ساتھ وحی اور اس کی پیش کردہ ذمہ داریوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اللہ کے وجود کا بھی وہ تصور اختیار کیا گیا ہے جو ایک اضافی اور قابلِ تغیر چیز ہے اور انسان کا اپنا ایجاد کردہ ہے[۱]۔"

ڈاکٹر محمد ناصر نے اپنی اس تقریر میں سکارنو کے صرف تصورِ خدا ہی پر بھرپور تنقید نہ کی بلکہ پنج شیلا کے اس پورے فلسفے کی فکری لغزشیں اور قوم کے لیے ان کی مضرت رسانیوں کی بھی پوری پوری وضاحت کی جسے اس نے پیش کیا تھا۔ انہوں نے بڑی تفصیل سے یہ بتایا کہ پنج شیلا کا یہ فلسفہ ایسے بے ربط اور بے جوڑ عناصر کا مجموعہ ہے جن میں کوئی مقصدی ترتیب نہیں پائی جاتی، اس لیے یہ کسی قوم کا فلسفۂ حیات نہیں بن سکتا۔ کسی نظریہ کو زندگی کی غایتِ اولیٰ بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس نظریہ کے فکری اور عملی گوشوں میں مکمل ہم آہنگی ہو اور اس کا پورا نظامِ فکر، نظامِ اخلاق، نظامِ معیشت، نظامِ معاشرت ایک بنیادی تصورِ حیات کے رُخِ زیبا کا عکس ہو۔

---

[۱] "نظامِ اسلامی مشاہیرِ اسلام کی نظر میں"۔ مرتبہ جناب خلیل احمد حامدی صاحب صفحہ ۲۵

لیکن پنچ شیلا کسی اساسی قدر کا ترجمان نہیں۔ اس کے مختلف اجزا اور عناصر کو ہر شخص اپنے ذوق اور منشا کے مطابق قبول کر لیتا ہے اور جس اصول کو چاہتا ہے رد کر دیتا ہے۔ مثلاً اشتراکی اقرارِ خدا کے اصول کو بلا تامل مسترد کرتے ہیں۔ اور اس کے باوجود پنچ شیلا کے پلیٹ فارم پر متحد ہونے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے مقابلے میں اگر مسلمان اپنے دینی تقاضوں کے تحت اس بیکار فلسفے کو اپنانے سے انکار کرتا ہے تو اُسے قوم اور وطن کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر نے اپنی اس تنقید میں پنچ شیلا کے علمبرداروں کے عملی تضاد کی بھی نہایت عمدہ انداز میں نشاندہی کی اور دلائل سے ثابت کیا کہ جمہوریت کا دم بھرنے والے اور قومی تعمیر و ترقی کے لیے مختلف فلسفے گھڑنے اور منصوبے بنانے والے اسلام کے معاملے میں کتنا جمہوریت کش طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ پنچ شیلا کے نظریہ کے تحت جمہوریت کو مملکت کا ایک رہنما اصول مانتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ سب سے پہلے ملک کی اکثریت کے احساسات و جذبات کا احترام کرتے ہوئے یہاں اس نظامِ زندگی کو نافذ کرنے کی کوشش کریں جس کا وہ تقاضا کر رہی ہے۔ لیکن چونکہ وہ نظام حکمران طبقے کے مخصوص مفادات کی حفاظت نہیں کرتا اس لیے اسلام کو اجتماعی زندگی کی تشکیل میں دخیل نہیں ہونے دیا جاتا۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے انسان دوستی اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کی بھی قلعی کھولی اور یہ بتایا کہ ان کی حیثیت دلفریب اور کھوکھلے نعروں سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ انسان دوستی اور معاشرتی انصاف کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں اُس نظریۂ حیات پر غور کرنا ہو گا جس کے منبع سے یہ تصورات سیراب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اشتراکیت انسان دوستی کا جو تصور رکھتی ہے وہ اسلام سے یکسر مختلف ہے۔ ایک

> کمیونسٹ ریاست انفرادی ملکیت کو انسان دوستی اور معاشرتی انصاف کے لیے سمِ قاتل سمجھتی ہے لیکن اسلامی ریاست میں انفرادی ملکیت۔ انسان دوستی اور معاشرتی انصاف کے لیے ناگزیر شرط ہے، کیونکہ اگر اس سے دین کے مطابق استفادہ کیا جائے

(باقی ص ۵۵ پر)

تفہیم القرآن

النّجم

(۳)

اب ذرا بتاؤ، تم نے کبھی اِس لات، اور اِس عُزّیٰ، اور تیسری ایک اور دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا[۱۵]؟ کیا بیٹے تمہارے لیے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لیے[۱۶]؟ یہ تو پھر بڑی دھاندلی

---

[۱۵] مطلب یہ ہے کہ جو تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلّم تم کو دے رہے ہیں اُس کو تو تم لوگ گمراہی اور بدراہی قرار دیتے ہو، حالانکہ یہ علم ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جارہا ہے اور اللہ ان کو آنکھوں سے وہ حقائق دکھا چکا ہے جن کی شہادت وہ تمہارے سامنے دے رہے ہیں۔ اب ذرا تم خود دیکھو کہ جن عقائد کی پیروی پر تم اصرار کیے چلے جارہے ہو وہ کس قدر غیر معقول ہیں، اور اِن کے مقابلے میں جو شخص تمہیں سیدھا راستہ بتا رہا ہے اس کی مخالفت کرکے آخر تم کس کا نقصان کر رہے ہو۔ اس سلسلے میں خاص طور پر اُن تین دیویوں کو بطورِ مثال لیا گیا ہے جن کو مکہ، طائف، مدینہ، اور نواحِ حجاز کے لوگ سب سے زیادہ پُوجتے تھے۔ ان کے بارے میں سوال کیا گیا ہے کہ کبھی تم نے عقل سے کام لیکر سوچا بھی کہ زمین و آسمان کی خدائی کے معاملات میں ان کا کوئی ادنیٰ سا دخل بھی ہوسکتا ہے؟ یا خداوندِ عالم سے واقعی ان کا کوئی رشتہ ہوسکتا ہے؟

لات کا استھان طائف میں تھا اور بنی ثقیف اس کے اِس حد تک معتقد تھے کہ جب اَبرہہ ہاتھیوں کی فوج لے کر خانۂ کعبہ کو توڑنے کے لیے مکہ پر چڑھائی کرنے جارہا تھا اس وقت ان لوگوں نے محض اپنے اس معبُود کے آستانے کو بچانے کی خاطر اُس ظالم کو مکّے کا راستہ بتانے کے لیے بدرقے فراہم کیے تاکہ وہ لات کو ہاتھ نہ لگائے، حالانکہ تمام اہلِ عرب کی طرح ثقیف کے لوگ بھی یہ مانتے تھے کہ کعبہ اللہ کا گھر ہے۔ لات کے معنی

میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن جریر طبری کی تحقیق یہ ہے کہ یہ اللہ کی تانیث ہے، یعنی اصل میں یہ لفظ اللٰہۃ تھا جسے اللات کر دیا گیا۔ زمخشری کے نزدیک یہ لَوٰی یَلوِی سے مشتق ہے، جس کے معنی مڑنے اور کسی کی طرف جھکنے کے ہیں۔ چونکہ مشرکین عبادت کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے اور اس کے آگے جھکتے اور اس کا طواف کرتے تھے اس لیے اس کو لات کہا جانے لگا۔ ابن عباسؓ اس کو لاتّ بتشدیدِ تاء پڑھتے ہیں اور اسے لتّ یلتّ سے مشتق قرار دیتے ہیں جس کے معنی سَننے اور لتھیڑنے کے ہیں۔ اُن کا اور مجاہد کا بیان ہے کہ یہ دراصل ایک شخص تھا جو طائف کے قریب ایک چٹان پر رہتا تھا اور حج کے لیے جانے والوں کو ستو پلاتا اور کھانا کھلاتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو لوگوں نے اسی چٹان پر اس کا استھان بنا لیا اور اس کی عبادت کرنے لگے۔ مگر لات کی یہ تشریح ابن عباس اور مجاہد جیسے بزرگوں سے مروی ہونے کے باوجود دو وجوہ سے قابلِ قبول نہیں ہے۔ ایک یہ کہ قرآن میں اسے لات کہا گیا ہے نہ کہ لاتّ۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید ان تینوں کو دیویاں بتا رہا ہے، اور اس روایت کی رو سے لات مرد تھا نہ کہ عورت۔

عُزّٰی عزیز کی تانیث ہے جس کے معنی عزت والی کے ہیں۔ یہ قریش کی خاص دیوی تھی اور اس کا استھان مکہ اور طائف کے درمیان وادیٔ نخلہ میں حُراض کے مقام پر واقع تھا (نخلہ کی جائے وقوع کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، صفحہ ۶۱۸-۶۱۹)۔ بنی ہاشم کے حلیف قبیلۂ بنی شَیبان کے لوگ اس کے مجاور تھے۔ قریش اور دوسرے قبائل کے لوگ اس کی زیارت کرتے اور اس پر نذریں چڑھاتے اور اس کے لیے قربانیاں کرتے تھے۔ کعبہ کی طرح اس کی طرف بھی ہَدی کے جانور لے جائے جاتے اور تمام بتوں سے بڑھ کر اس کی عزت کی جاتی تھی۔ ابنِ ہشام کی روایت ہے کہ ابواُحیحہ جب مرنے لگا تو ابولہب اس کی عیادت کے لیے گیا۔ دیکھا کہ وہ رو رہا ہے۔ ابولہب نے کہا کیوں روتے ہو ابواُحیحہ؟ کیا موت سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ وہ سب ہی کو آنی ہے۔ اس نے کہا خدا کی قسم مَیں موت سے ڈر کر نہیں روتا، بلکہ مجھے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ میرے بعد عُزّٰی کی پُوجا کیسے ہوگی۔ ابولہب بولا، اس کی پُوجا نہ تمہاری زندگی میں تمہاری خاطر ہوتی تھی اور نہ تمہارے بعد اسے چھوڑا جائے گا۔ ابواُحیحہ نے کہا اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے بعد کوئی میری جگہ سنبھالنے والا ہے۔

مَناۃ کا استھان مکہ اور مدینہ کے درمیان بحرِ احمر کے کنارے قُدَید کے مقام پر تھا اور خاص طور پر خُزاعہ

کی تقسیم ہوئی! دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔[۱۷] حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشاتِ نفس کے مُرید بنے ہوئے ہیں۔[۱۸] حالانکہ ان کے رب کی طرف سے اُن کے پاس ہدایت آچکی ہے۔[۱۹]

اور اَوس اور خزرج کے لوگ اس کے بہت معتقد تھے۔ اس کا حج اور طواف کیا جاتا اور اس پر نذر کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ زمانۂ حج میں جب حُجاج طواف بیت اللہ اور عرفات اور منیٰ سے فارغ ہو جاتے تو وہیں سے مناۃ کی زیارت کے لیے لبیک لبیک کی صدائیں بلند کر دی جاتیں اور جو لوگ اِس دوسرے "حج" کی نیت کر لیتے وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہ کرتے تھے۔

۱۶؎ یعنی اِن دیویوں کو تم نے اللہ رب العٰلمین کی بیٹیاں قرار دے لیا اور یہ بیہودہ عقیدہ ایجاد کرتے وقت تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اپنے لیے تو تم بیٹی کی پیدائش کو ذلت سمجھتے ہو اور چاہتے ہو کہ تمہیں اولاد نرینہ ملے، مگر اللہ کے لیے تم اولاد بھی تجویز کرتے ہو تو بیٹیاں!

۱۷؎ یعنی تم جن کو دیوی اور دیوتا کہتے ہو وہ نہ دیویاں ہیں اور نہ دیوتا، نہ ان کے اندر اُلوہیت کی کوئی صفت پائی جاتی ہے، نہ خدائی کے اختیارات کا کوئی ادنیٰ سا حصہ انہیں حاصل ہے۔ تم نے بطورِ خود ان کو خدا کی اولاد اور معبود اور خدائی میں شریک ٹھیرا لیا ہے۔ خدا کی طرف سے کوئی سند ایسی نہیں آئی ہے جسے تم اپنے اِن مفروضات کے ثبوت میں پیش کر سکو۔

۱۸؎ بالفاظ دیگر اُن کی گمراہی کے بنیادی وجوہ دو ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کسی چیز کو اپنا عقیدہ اور دین بنانے کے لیے علم حقیقت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے بلکہ محض قیاس و گمان سے ایک بات فرض کر لیتے ہیں اور پھر اس پر اس طرح ایمان لے آتے ہیں کہ گویا وہی حقیقت ہے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے یہ رویہ دراصل اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اختیار کیا ہے۔ اُن کا دل یہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسا معبود موجود ہو جو دنیا میں اُن کے کام تو بناتا رہے اور آخرت اگر پیش آنے والی ہی ہو تو وہاں انہیں بخشوانے کا ذمہ بھی لے لے، مگر حرام و حلال کی کوئی پابندی ان پر نہ لگائے اور اخلاق کے کسی ضابطے میں ان کو نہ کسے۔ اسی لیے وہ انبیاء کے لائے ہوئے طریقے پر خدائے واحد کی بندگی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اِن خود ساختہ معبودوں اور معبودنیوں کی

ع کیا انسان جو کچھ چاہے اس کے لیے وہی حق ہے [۲۰]؟ دنیا اور آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے ع
آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں، اُن کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آسکتی جب تک کہ اللہ کسی ایسے
شخص کے حق میں اُس کی اجازت نہ دے جس کے لیے وہ کوئی عرضداشت سننا چاہے اور اس کو پسند کرے [۲۱]۔
مگر جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے وہ فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں [۲۲]۔ حالانکہ اس معاملہ کا

عبادت ہی اُن کو پسند آتی ہے۔

۱۹؎ یعنی ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان گمراہ لوگوں کو حقیقت بتاتے رہے ہیں اور اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر ان کو بتا دیا ہے کہ کائنات میں دراصل خدائی کس کی ہے۔

۲۰؎ اس آیت کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا انسان کو یہ حق ہے کہ جس کو چاہے معبود بنالے؟ اور ایک تیسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ کیا انسان ان معبودوں سے اپنی مرادیں پا لینے کی جو تمنا رکھتا ہے وہ کبھی پوری ہو سکتی ہے؟

۲۱؎ یعنی تمام فرشتے مل کر بھی اگر کسی کی شفاعت کریں تو وہ اس کے حق میں نافع نہیں ہو سکتی، کجا کہ تمہارے ان بناوٹی معبودوں کی شفاعت کسی کی بگڑی بنا سکے۔ خدائی کے اختیارات سارے کے سارے بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ فرشتے بھی اس کے حضور کسی کی سفارش کرنے کی اُس وقت تک جسارت نہیں کر سکتے جب تک وہ انہیں اس کی اجازت نہ دے اور کسی کے حق میں اُن کی سفارش سننے پر راضی نہ ہو۔

۲۲؎ یعنی ایک حماقت تو اُن کی یہ ہے کہ ان بے اختیار فرشتوں کو جو اللہ تعالیٰ سے سفارش تک کرنے کا یارا نہیں رکھتے اُنہوں نے معبود بنا لیا ہے۔ اس پر مزید حماقت یہ کہ وہ انہیں عورتیں سمجھتے ہیں اور ان کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔ ان ساری جہالتوں میں ان کے مبتلا ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ آخرت کو نہیں مانتے۔ اگر وہ آخرت کے ماننے والے ہوتے تو کبھی ایسی غیر ذمہ دارانہ باتیں نہ کر سکتے تھے۔ انکار آخرت نے انہیں انجام سے بے فکر بنا دیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کو ماننے یا نہ ماننے، یا ہزاروں خدا مان بیٹھنے سے کوئی فرق نہیں ہوتا، کیونکہ ان میں سے کسی عقیدے کا بھی کوئی اچھا یا بُرا نتیجہ دنیا کی موجودہ زندگی میں نکلتا نظر نہیں آتا۔ منکرین خدا ہوں یا مشرکین یا موحدین، سب کی کھیتیاں پکتی بھی ہیں اور جلتی بھی ہیں۔ سب بیمار بھی ہوتے ہیں اور

کوئی علم انہیں حاصل نہیں ہے، وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں[۲۳]، اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔

پس اے نبی، جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے[۲۴]، اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے، اُسے اس کے حال پر چھوڑ دو[۲۵] ——— اِن لوگوں کا مبلغِ علم بس یہی کچھ ہے[۲۶]، یہ بات تیرا رب ہی

تندرست بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ہر طرح کے اچھے اور بُرے حالات سب پر گزرتے ہیں۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ کوئی بڑا اہم اور سنجیدہ معاملہ نہیں ہے کہ آدمی کسی کو معبود مانے یا نہ مانے، یا جتنے اور جیسے چاہے معبود بنالے۔ حق اور باطل کا فیصلہ جب ان کے نزدیک اسی دنیا میں ہونا ہے، اور اُس کا مدار اسی دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج پر ہے، تو ظاہر ہے کہ یہاں کے نتائج نہ کسی عقیدے کے حق ہونے کا قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں نہ کسی دوسرے عقیدے کے باطل ہونے کا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لیے ایک عقیدے کو اختیار کرنا اور دوسرے عقیدے کو رد کر دینا محض ایک من کی موج کا معاملہ ہے۔

۲۳؎ یعنی ملائکہ کے متعلق یہ عقیدہ انہوں نے کچھ اس بنا پر اختیار نہیں کیا ہے کہ انہیں کسی ذریعۂ علم سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ عورتیں ہیں اور خدا کی بیٹیاں ہیں، بلکہ انہوں نے محض اپنے قیاس و گمان سے ایک بات فرض کر لی ہے اور اس پر یہ آستانے بنائے بیٹھے ہیں جن سے مرادیں مانگی جا رہی ہیں اور نذریں اور نیازیں ان پر چڑھائی جا رہی ہیں۔

۲۴؎ ذکر کا لفظ یہاں کئی معنی دے رہا ہے۔ اس سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے، محض نصیحت بھی مراد ہو سکتی ہے، اور اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کا ذکر سننا ہی جسے گوارا نہیں ہے۔

۲۵؎ یعنی اُس کے پیچھے نہ پڑو اور اُسے سمجھانے پر اپنا وقت ضائع نہ کرو، کیونکہ ایسا شخص کسی ایسی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا جس کی بنیاد خدا پرستی پر ہو، جو دنیا کے مادّی فائدوں سے بلند تر مقاصد اور اقدار کی طرف بلاتی ہو، اور جس میں اصل مطلوب آخرت کی ابدی فلاح و کامرانی کو قرار دیا جا رہا ہو۔ اس قسم کے مادہ پرست اور خدا بیزار انسان پر اپنی محنت صرف کرنے کے بجائے توجہ اُن لوگوں کی طرف کرو جو خدا کا ذکر سننے کے لیے تیار ہوں اور دنیا پرستی کے مرض میں مبتلا نہ ہوں۔

زیادہ جانتا ہے کہ اُس کے راستے سے کون بھٹک گیا ہے اور کون سیدھے راستے پر ہے، اور زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے[28] ــــــــــ تاکہ[29] اللہ بُرائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور اُن لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویّہ اختیار کیا ہے، جو بڑے بڑے گناہوں[30] اور کھلے کھلے قبیح افعال[31] سے پرہیز کرتے ہیں، اِلّا یہ کہ کچھ قصور اُن سے سرزد ہو جائے۔[32]

۲۶ے یہ جملۂ معترضہ ہے جو سلسلۂ کلام کو بیچ میں توڑ کر پچھلی بات کی تشریح کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے۔

۲۷ے یعنی یہ لوگ دنیا اور اس کے فوائد سے آگے نہ کچھ جانتے ہیں نہ سوچ سکتے ہیں، اس لیے ان پر محنت صرف کرنا لاحاصل ہے۔

۲۸ے بالفاظ دیگر کسی آدمی کے گمراہ یا برسرِ ہدایت ہونے کا فیصلہ نہ اِس دنیا میں ہوتا ہے، نہ اس کا فیصلہ دنیا کے لوگوں کی رائے پر چھوڑا گیا ہے۔ اس کا فیصلہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہی زمین و آسمان کا مالک ہے، اور اسی کو یہ معلوم ہے کہ دنیا کے لوگ جن مختلف راہوں پر چل رہے ہیں اُن میں سے ہدایت کی راہ کون سی ہے اور ضلالت کی راہ کون سی۔ لہٰذا تم اس بات کی کوئی پروا نہ کرو کہ یہ مشرکین عرب اور یہ کفارِ مکہ تم کو بہکا اور بھٹکا ہُوا آدمی قرار دے رہے ہیں اور اپنی جاہلیت ہی کو حق اور ہدایت سمجھ رہے ہیں۔ یہ اگر اپنے اِسی زعمِ باطل میں مگن رہنا چاہتے ہیں تو انہیں مگن رہنے دو۔ اِن سے بحث و تکرار میں وقت ضائع کرنے اور سر کھپانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۲۹ے یہاں سے پھر وہی سلسلۂ کلام شروع ہو جاتا ہے جو اُوپر سے چلا آ رہا تھا۔ گویا جملۂ معترضہ کو چھوڑ کر سلسلۂ عبارت یُوں ہے "اُسے اس کے حال پر چھوڑ دو تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے"۔

۳۰ے تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۳۴۶-۳۴۷۔

۳۱ے تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص ۵۹۹۔ جلد دوم، ص ۵۶۶۔

۳۲ے اصل الفاظ ہیں اِلَّا اللَّمَمَ۔ عربی زبان میں لَمَم کا لفظ کسی چیز کی تھوڑی سی مقدار، یا اُس کے خفیف سے اثر، یا اُس کے محض قُرب، یا اُس کے ذرا سی دیر رہنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں اَلَمَّ بِالْمَکَانِ وہ شخص فلاں جگہ تھوڑی دیر ہی ٹھیرا، یا تھوڑی دیر کے لیے ہی وہاں گیا۔ اَلَمَّ بِالطَّعَامِ، اس نے تھوڑا سا کھانا

کھایا۔ بہٖ لممٌ، اس کا دماغ ذرا سا کھسکا ہُوا ہے، یا اس میں کچھ جنُون کی ٹک ہے۔ یہ لفظ اس معنی میں بولتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک فعل کا ارتکاب تو نہیں کیا مگر ارتکاب کے قریب تک پہنچ گیا۔ فَراء کا قول ہے کہ میں نے عربوں کو اس طرح کے فقرے بولتے سنا ہے ضربہ مالمم القتل، فلاں شخص نے اُسے اتنا مارا کہ بس مار ڈالنے کی کسر رہ گئی۔ اور اَلَمَّ یفعل، قریب تھا کہ فلاں شخص یہ فعل کر گزرتا۔ شاعر کہتا ہے اَلَمَّتْ فحیّتْ ثم قامت فودّعت، وہ بس ذرا کی ذرا آئی، سلام کیا، اٹھی اور رخصت ہو گئی۔

ان استعمالات کی بنا پر اہلِ تفسیر میں سے بعض نے لمم سے مراد چھوٹے گناہ لیے ہیں، بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آدمی عملاً کسی بڑے گناہ کے قریب تک پہنچ جائے مگر اس کا ارتکاب نہ کرے، بعض اسے کچھ دیر کے لیے گناہ میں مبتلا ہونے اور پھر اس سے باز آ جانے کے معنی میں لیتے ہیں، اور بعض کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی گناہ کا خیال، یا اس کی خواہش، یا اس کا ارادہ تو کرے مگر عملاً کوئی اقدام نہ کرے۔ اس سلسلے میں صحابہ و تابعین کے اقوال حسبِ ذیل ہیں:

زید بن اسلم اور ابنِ زید کہتے ہیں، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ معاصی ہیں جن کا ارتکاب اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانے میں لوگ کر چکے تھے، پھر اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔

ابن عباس کا دوسرا قول یہ ہے، اور یہی حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن عاص، مجاہدؒ، حسن بصریؒ اور ابوصالح کا قول بھی ہے کہ اس سے مراد آدمی کا کسی بڑے گناہ یا کسی فحش فعل میں کچھ دیر کے لیے، یا احیاناً مبتلا ہو جانا اور پھر اُسے چھوڑ دینا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور مسروق اور شَعبی فرماتے ہیں اور حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی معتبر روایات میں یہ قول منقول ہُوا ہے کہ اس سے مراد آدمی کا کسی بڑے گناہ کے قریب تک پہنچ جانا اور اس کے ابتدائی مدارج تک طے کر گزرنا مگر آخری مرحلے پر پہنچ کر رک جانا ہے۔ مثلاً کوئی شخص چوری کے لیے جائے، مگر چرانے سے باز رہے۔ یا اجنبیہ سے اختلاط کرے، مگر زنا کا اقدام نہ کرے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر، عِکرِمہ، قَتادہ اور ضَحاک کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ چھوٹے چھوٹے گناہ

بلاشبہ تیرے رب کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔[۳۳] وہ تمہیں اس وقت سے خوب جانتا ہے جب

ہیں جن کے لیے دنیا میں بھی کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے اور آخرت میں بھی جن پر عذاب دینے کی کوئی وعید نہیں فرمائی گئی ہے۔

سعید بن المسیّب فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہے گناہ کا خیال دل میں آنا مگر عملاً اس کا ارتکاب نہ کرنا۔

یہ حضراتِ صحابہ و تابعین کی مختلف تفسیریں ہیں جو روایات میں منقول ہوئی ہیں۔ بعد کے مفسرین اور ائمہ و فقہاء کی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ یہ آیت اور سورۂ نساء کی آیت ۳۱ صاف طور پر گناہوں کو دو بڑی اقسام پر تقسیم کرتی ہیں، ایک کبائر، دوسرے صغائر، اور یہ دونوں آیتیں انسان کو امید دلاتی ہیں کہ اگر وہ کبائر اور فواحش سے پرہیز کرے تو اللہ تعالیٰ اصغائر سے درگزر فرمائے گا۔ اگرچہ بعض اکابر علماء نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ کوئی معصیت چھوٹی نہیں ہے بلکہ خدا کی معصیت بجائے خود کبیرہ ہے۔ لیکن جیسا کہ امام غزالیؒ نے فرمایا ہے، کبائر اور صغائر کا فرق ایک ایسی چیز ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ جن ذرائعِ معلومات سے احکامِ شریعت کا علم حاصل ہوتا ہے وہ سب اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ صغیرہ اور کبیرہ گناہوں میں فرق کیا ہے اور کس قسم کے گناہ صغیرہ اور کس قسم کے کبیرہ ہیں، تو اس معاملہ میں جس بات پر ہمارا اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ "ہر وہ فعل گناہِ کبیرہ ہے جسے کتاب و سنت کی کسی نصِّ صریح نے حرام قرار دیا ہو، یا اُس کے لیے اللہ اور اس کے رسول نے دنیا میں کوئی سزا مقرر کی ہو، یا اُس پر آخرت میں عذاب کی وعید سنائی ہو، یا اس کے مرتکب پر لعنت کی ہو، یا اس کے مرتکبین پر نزولِ عذاب کی خبر دی ہو" ——— اس نوعیت کے گناہوں کے ماسوا جتنے افعال بھی شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہیں وہ سب صغائر کی تعریف میں آتے ہیں۔ اسی طرح کبیرہ کی محض خواہش یا اس کا ارادہ بھی کبیرہ نہیں بلکہ صغیرہ ہے۔ حتیٰ کہ کسی بڑے گناہ کے ابتدائی مراحل طے کر جانا بھی اُس وقت تک گناہ کبیرہ نہیں ہے جب تک آدمی اس کا ارتکاب نہ کر گزرے۔ البتہ گناہ صغیرہ بھی ایسی حالت میں کبیرہ ہو جاتا ہے جبکہ وہ دین کے استخفاف اور اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں استکبار کے جذبہ سے کیا جائے، اور اس کا مرتکب اُس شریعت کو کسی اعتناء کے

اُس نے زمین سے تمہیں پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں ابھی جنین ہی تھے۔ پس اپنے نفس کی پاکی کے دعوے نہ کرو، وہی بہتر جانتا ہے کہ واقعی متقی کون ہے۔ ع۲

پھر اے نبی، تم نے اُس شخص کو بھی دیکھا جو راہِ خدا سے پھر گیا اور تھوڑا سا دے کر رُک گیا ۳۴؟ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھ رہا ہے ۳۵؟ کیا اُسے اُن باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اُس ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا ۳۶؟

لائق نہ سمجھے جس نے اسے ایک بُرائی قرار دیا ہے۔

۳۳؎ یعنی صغائر کے مرتکب کا معاف کر دیا جانا کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ صغیرہ گناہ، گناہ نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ تنگ نظری اور خوردہ گیری کا معاملہ نہیں فرماتا۔ بندے اگر نیکی اختیار کریں، اور کبائر و فواحش سے اجتناب کرتے رہیں تو وہ اُن کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت نہ فرمائے گا اور اپنی رحمتِ بے پایاں کی وجہ سے ان کو ویسے ہی معاف کر دے گا۔

۳۴؎ اشارہ ہے وَلید بن مُغیرہ کی طرف جو قریش کے بڑے سرداروں میں سے ایک تھا۔ ابن جریر طبری کی روایت ہے کہ یہ شخص پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ مگر جب اس کے ایک مشرک دوست کو معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہونے کا ارادہ کر رہا ہے تو اس نے کہا کہ تم دینِ آبائی کو نہ چھوڑو، اگر تمہیں عذابِ آخرت کا خطرہ ہے تو مجھے اتنی رقم دے دو، میں ذمہ لیتا ہوں کہ تمہارے بدلے وہاں کا عذاب میں بھگت لونگا۔ ولید نے یہ بات مان لی اور خدا کی راہ پر آتے آتے اُس سے پھر گیا، مگر جو رقم اس نے اپنے مشرک دوست کو دینی طے کی تھی وہ بھی بس تھوڑی سی دی اور باقی روک لی۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود کفارِ مکہ کو یہ بتانا تھا کہ آخرت سے بے فکری اور دین کی حقیقت سے بے خبری نے ان کو کیسی جہالتوں اور حماقتوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔

۳۵؎ یعنی کیا اسے معلوم ہے کہ یہ روش اس کے لیے نافع ہے؟ کیا وہ جانتا ہے کہ آخرت کے عذاب سے کوئی اس طرح بھی بچ سکتا ہے؟

۳۶؎ آگے اُن تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا جا رہا ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں میں نازل ہوئی تھیں۔ حضرت موسیٰ کے صحیفوں سے مراد توراۃ ہے۔ رہے حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے تو وہ آج دنیا میں کہیں موجود

"یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا،[۳۷]
اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے[۳۸]،

نہیں ہیں، اور یہود و نصاریٰ کی کتبِ مقدسہ میں بھی اُن کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ صرف قرآن ہی وہ کتاب ہے جس میں دو مقامات پر صحفِ ابراہیمؑ کی تعلیمات کے بعض اجزاء نقل کیے گئے ہیں، ایک یہ مقام، دوسرے سورۂ الاعلیٰ کی آخری آیات۔

۳۷ اِس آیت سے تین بڑے اصول مستنبط ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر شخص خود اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص کے فعل کی ذمہ داری دوسرے پر نہیں ڈالی جا سکتی اِلّا یہ کہ اُس فعل کے صُدور میں اس کا اپنا کوئی حصہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی شخص اگر چاہے بھی تو کسی دوسرے شخص کے فعل کی ذمہ داری اپنے اوپر نہیں لے سکتا، نہ اصل مجرم کو اس بنا پر چھوڑا جا سکتا ہے کہ اس کی جگہ سزا بھگتنے کے لیے کوئی اور آدمی اپنے آپ کو پیش کر رہا ہے۔

۳۸ اس ارشاد سے بھی تین اہم اصول نکلتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر شخص جو کچھ بھی پائے گا اپنے عمل کا پھل پائے گا۔ دوسرے یہ کہ ایک شخص کے عمل کا پھل دوسرا نہیں پا سکتا، اِلّا یہ کہ اُس عمل میں اُس کا اپنا کوئی حصہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی شخص سعی و عمل کے بغیر کچھ نہیں پا سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس آیت کی رُو سے ایک شخص کا عمل دوسرے شخص کے لیے کسی صورت میں بھی نافع نہیں ہو سکتا؟ اور کیا ایک شخص اگر دوسرے شخص کے لیے یا اُس کے بدلے کوئی عمل کرے تو وہ اس کی طرف سے قبول نہیں کیا جا سکتا؟ اور کیا یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص اپنے عمل کے اجر کو دوسرے کی طرف منتقل کر سکے؟

ان سوالات کا جواب اگر نفی میں ہو تو ایصالِ ثواب اور حجِ بدل وغیرہ سب ناجائز ہو جاتے ہیں، بلکہ دوسرے کے حق میں دعائے استغفار بھی بے معنی ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ دعا بھی اُس شخص کا اپنا عمل نہیں ہے جس کے حق میں دعا کی جائے۔ مگر یہ انتہائی نقطۂ نظر معتزلہ کے سوا اہلِ اسلام میں سے کسی نے اختیار نہیں کیا ہے۔ صرف وہ اِس آیت کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ایک شخص کی سعی دوسرے کے لیے کسی حال میں بھی نافع نہیں ہو سکتی۔

بخلاف اس کے اہلِ سنّت ایک شخص کے لیے دوسرے کی دعا کے نافع ہونے کو تو بالاتفاق مانتے ہیں، کیونکہ وہ قرآن سے ثابت ہے، البتہ ایصالِ ثواب اور نیابتہً دوسرے کی طرف سے کسی نیک کام کے نافع ہونے ہیں ان کے درمیان اصولاً نہیں بلکہ صرف تفصیلات میں اختلاف ہے۔

(۱) ایصالِ ثواب یہ ہے کہ ایک شخص کوئی نیک عمل کر کے اللہ سے دعا کرے کہ اس کا اجر و ثواب کسی دوسرے شخص کو عطا فرما دے۔ اس مسئلے میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خالص بدنی عبادات، مثلاً نماز، روزہ اور تلاوتِ قرآن وغیرہ کا ثواب دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا، البتہ مالی عبادات، مثلاً صدقہ، یا مالی و بدنی مرکّب عبادات، مثلاً حج کا ثواب دوسرے کو پہنچ سکتا ہے، کیونکہ اصل یہ ہے کہ ایک شخص کا عمل دوسرے کے لیے نافع نہ ہو، مگر چونکہ احادیثِ صحیحہ کی رُو سے صدقہ کا ثواب پہنچایا جا سکتا ہے اور حجّ بدل کیا جا سکتا ہے، اس لیے ہم اسی نوعیت کی عبادات تک ایصالِ ثواب کی صحت تسلیم کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ انسان اپنے ہر نیک عمل کا ثواب دوسرے کو ہبہ کر سکتا ہے خواہ وہ نماز ہو یا روزہ یا تلاوتِ قرآن یا ذکر یا صدقہ یا حج و عمرہ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آدمی جس طرح مزدوری کر کے مالک سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کی اجرت میرے بجائے فلاں شخص کو دے دی جائے، اسی طرح وہ کوئی نیک عمل کر کے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کر سکتا ہے کہ اس کا اجر میری طرف سے فلاں شخص کو عطا کر دیا جائے۔ اس میں بعض اقسام کی نیکیوں کو مستثنیٰ کرنے اور بعض دوسری اقسام کی نیکیوں تک اسے محدود رکھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ یہی بات بکثرت احادیث سے بھی ثابت ہے:

بخاری، مسلم، مُسند احمد، ابن ماجہ، طبرانی (فی الاوسط)، مستدرک اور ابنِ ابی شیبہ میں حضرت عائشہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابو رافع، حضرت ابو طلحہ انصاری، اور حذیفہ بن اُسید الغفاری کی متفقہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مینڈھے لے کر ایک اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے قربان کیا اور دوسرا اپنی امت کی طرف سے۔

مسلم، بخاری، مسند احمد، ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری ماں کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر انہیں بات کرنے کا موقع

ملتا تو وہ ضرور صدقہ کرنے کے لیے کہتیں۔ اب اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کے لیے اجر ہے؟ فرمایا ہاں۔

مُسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص کی روایت ہے کہ ان کے دادا عاص بن وائل نے زمانہ جاہلیت میں سو اونٹ ذبح کرنے کی نذر مانی تھی۔ ان کے چچا ہشام بن العاص نے اپنے حصے کے پچاس اونٹ ذبح کر دیئے حضرت عَمرو بن العاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میں کیا کروں۔ حضورؐ نے فرمایا اگر تمہارے باپ نے توحید کا اقرار کر لیا تھا تو تم ان کی طرف سے روزہ رکھو یا صدقہ کرو، وہ ان کے لیے نافع ہوگا۔

مُسند احمد، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت حسن بصری کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عُبادہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، کیا میں ان کی طرف سے صدقہ کروں؟ آپؐ نے فرمایا ہاں۔ اسی مضمون کی متعدد دوسری روایات بھی حضرت عائشہ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباس سے بخاری، مسلم، مُسند احمد، نسائی، ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں موجود ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کی طرف سے صدقہ کرنے کی اجازت دی ہے اور اسے میت کے لیے نافع بتایا ہے۔

دارقُطنی میں ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے عرض کیا میں اپنے والدین کی خدمت ان کی زندگی میں تو کرتا ہوں، ان کے مرنے کے بعد کیسے کروں؟ فرمایا "یہ بھی ان کی خدمت ہی ہے کہ ان کے مرنے کے بعد تو اپنی نماز کے ساتھ ان کے لیے بھی نماز پڑھے اور اپنے روزوں کے ساتھ ان کے لیے بھی روزے رکھے۔ ایک دوسری روایت دارقطنی میں حضرت علیؓ سے مروی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا جس شخص کا قبرستان پر گزر ہو اور وہ گیارہ مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھ کر اس کا اجر مرنے والوں کو بخش دے تو جتنے مُردے ہیں اتنا ہی اجر عطا کر دیا جائیگا۔

یہ کثیر روایات جو ایک دوسری کی تائید کر رہی ہیں، اس امر کی تصریح کرتی ہیں کہ ایصالِ ثواب نہ صرف ممکن ہے، بلکہ ہر طرح کی عبادات اور نیکیوں کے ثواب کا ایصال ہو سکتا ہے اور اس میں کسی خاص نوعیت کے اعمال کی تخصیص نہیں ہے۔ مگر اس سلسلے میں چار باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں:

ایک یہ کہ ایصال اُسی عمل کے ثواب کا ہو سکتا ہے جو خالصتہً اللہ کے لیے اور قواعدِ شریعت کے مطابق کیا گیا ہو، ورنہ ظاہر ہے کہ غیر اللہ کے لیے یا شریعت کے خلاف جو عمل کیا جائے اس پر خود عمل کرنے والے ہی کو کسی قسم کا ثواب نہیں مل سکتا، کجا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف منتقل ہو سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں صالحین کی حیثیت سے مہمان ہیں ان کو تو ثواب کا ہدیہ یقیناً پہنچے گا مگر جو وہاں مجرم کی حیثیت سے حوالات میں بند ہیں انہیں کوئی ثواب پہنچنا متوقع نہیں ہے۔ اللہ کے مہمانوں کو ہدیہ تو پہنچ سکتا ہے، مگر امید نہیں کہ اللہ کے مجرم کو تحفہ پہنچ سکے۔ اُس کے لیے اگر کوئی شخص کسی غلط فہمی کی بنا پر ایصالِ ثواب کرے گا تو اس کا ثواب ضائع نہ ہوگا بلکہ مجرم کو پہنچنے کے بجائے اصل عامل ہی کی طرف پلٹ آئیگا۔ جیسے منی آرڈر اگر مُرسَل الیہ کو نہ پہنچے تو مُرسِل کو واپس مل جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ایصالِ ثواب تو ممکن ہے مگر ایصالِ عذاب ممکن نہیں ہے یعنی یہ تو ہو سکتا ہے کہ آدمی نیکی کرکے کسی دوسرے کے لیے اجر بخش دے اور وہ اس کو پہنچ جائے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی گناہ کرکے اس کا عذاب کسی کو بخشے اور وہ اسے پہنچ جائے۔

اور چوتھی بات یہ ہے کہ نیک عمل کے دو فائدے ہیں۔ ایک اس کے وہ نتائج جو عمل کرنے والے کی اپنی روح اور اس کے اخلاق پر مترتب ہوتے ہیں اور جن کی بنا پر وہ اللہ کے ہاں بھی جزا کا مستحق ہوتا ہے۔ دوسرے اس کا وہ اجر جو اللہ تعالیٰ بطورِ انعام اسے دیتا ہے۔ ایصالِ ثواب کا تعلق پہلی چیز سے نہیں ہے بلکہ صرف دوسری چیز سے ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص ورزش کرکے کشتی کے فن میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس سے جو طاقت اور مہارت اس میں پیدا ہوتی ہے وہ بہرحال اس کی ذات ہی کے لیے مخصوص ہے۔ دوسرے کی طرف وہ منتقل نہیں ہو سکتی۔ اِسی طرح اگر وہ کسی دربار کا ملازم ہے اور پہلوان کی حیثیت سے اس کے لیے ایک تنخواہ مقرر ہے تو وہ بھی اسی کو ملے گی، کسی اور کو نہ دے دی جائے گی۔ البتہ جو انعامات اس کی کارکردگی پر خوش ہو کر اس کا سرپرست اسے دے اس کے حق میں وہ درخواست کر سکتا ہے کہ وہ اس کے استاد، یا ماں باپ، یا دوسرے محسنوں کو اس کی طرف سے دے دیئے جائیں۔ ایسا ہی معاملہ اعمالِ حسنہ کا ہے کہ ان کے روحانی فوائد قابلِ انتقال نہیں ہیں، اور ان کی جزا بھی کسی کو منتقل نہیں ہو سکتی، مگر ان کے اجر و ثواب کے متعلق وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کر سکتا ہے کہ وہ اس کے کسی عزیز قریب یا اس کے کسی محسن کو عطا کر دیا جائے۔ اسی لیے اِس کو ایصالِ جزا نہیں بلکہ ایصالِ ثواب کہا جاتا ہے۔

(۲) ایک شخص کی سعی کے کسی اور شخص کے لیے نافع ہونے کی دوسری شکل یہ ہے کہ آدمی یا تو دوسرے

کی خواہش اور ایماء کی بنا پر اس کے لیے کوئی نیک عمل کرے، یا اس کی خواہش اور ایماء کے بغیر اُس کی طرف سے کوئی ایسا عمل کرے جو دراصل واجب تو اس کے ذمہ تھا مگر وہ خود اسے ادا نہ کر سکا۔ اس کے بارے میں فقہاءِ حنفیہ کہتے ہیں کہ عبادات کی تین قسمیں ہیں۔ ایک خالص بدنی، جیسے نماز۔ دوسری خالص مالی، جیسے زکوٰۃ۔ اور تیسری مالی و بدنی مرکب، جیسے حج۔ ان میں سے پہلی قسم میں نیابت نہیں چل سکتی، مثلاً ایک شخص کی طرف سے دوسرا شخص نیابتہً نماز نہیں پڑھ سکتا۔ دوسری قسم میں نیابت ہو سکتی ہے، مثلاً بیوی کے زیورات کی زکوٰۃ شوہر دے سکتا ہے۔ تیسری قسم میں نیابت صرف اُس حالت میں ہو سکتی ہے جبکہ اصل شخص، جس کی طرف سے کوئی فعل کیا جا رہا ہے، اپنا فریضہ خود ادا کرنے سے عارضی طور پر نہیں بلکہ مستقل طور پر عاجز ہو۔ مثلاً حجِ بدل ایسے شخص کی طرف سے ہو سکتا ہے جو خود حج کے لیے جانے پر قادر نہ ہو اور نہ یہ امید ہو کہ وہ کبھی اس کے قابل ہو سکے گا۔ مالکیہ اور شافعیہ بھی اس کے قائل ہیں۔ البتہ امام مالکؒ حجِ بدل کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ اگر باپ نے وصیت کی ہو کہ اُس کا بیٹا اس کے بعد اُس کی طرف سے حج کرے تو وہ حجِ بدل کر سکتا ہے ورنہ نہیں۔ مگر احادیث اس معاملہ میں بالکل صاف ہیں کہ باپ کا ایماء یا وصیت ہو یا نہ ہو، بیٹا اس کی طرف سے حجِ بدل کر سکتا ہے۔

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ قبیلۂ خَثْعَم کی ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے باپ کو فریضۂ حج کا حکم ایسی حالت میں پہنچا ہے کہ وہ بہت بوڑھا ہو چکا ہے، اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ نہیں سکتا۔ آپؐ نے فرمایا فَحُجِّی عَنْہ، "تو اس کی طرف سے حج کر لے" (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، نسائی)۔ قریب قریب اسی مضمون کی روایت حضرت علیؓ نے بھی بیان کی ہے (احمد، ترمذی)۔

حضرت عبداللہ بن زُبیرؓ قبیلۂ خثعم ہی کے ایک مرد کا ذکر کرتے ہیں کہ اس نے بھی اپنے بوڑھے باپ کے متعلق یہی سوال کیا تھا۔ حضورؐ نے پوچھا کیا تو اس کا سب سے بڑا لڑکا ہے؟ اس نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا ارأیت لو کان علی ابیك دین فقضیتہ عنہ اکان یجزی ذالك عنہ؟ "تیرا کیا خیال ہے، اگر تیرے باپ پر قرض ہو اور تو اُس کو ادا کر دے تو وہ اس کی طرف سے ادا ہو جائے گا؟" اس نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا فَاحْجُجْ عَنْہ "بس اسی طرح تو اس کی طرف سے حج بھی کر لے"۔ (احمد، نسائی)۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ قبیلۂ جُہَینہ کی ایک عورت نے آکر عرض کیا کہ میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی مگر وہ اس سے پہلے ہی مرگئی، اب کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "تیری ماں پر اگر قرض ہوتا تو کیا تو اس کو ادا نہ کر سکتی تھی؟ اسی طرح تم لوگ اللہ کا حق بھی ادا کرو، اور اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے ساتھ کیے ہوئے عہد پورے کیے جائیں" (بخاری۔ نسائی)۔ بخاری اور مُسند احمد میں ایک دوسری روایت یہ ہے کہ ایک مرد نے آکر اپنی بہن کے بارے میں وہی سوال کیا جو اوپر مذکور ہوا ہے اور حضورؐ نے اس کو بھی یہی جواب دیا۔

ان روایات سے مالی و بدنی مرکب عبادات میں نیابت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ رہیں خالص بدنی عبادات، تو بعض احادیث ایسی ہیں جن سے اِس نوعیت کی عبادات میں بھی نیابت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً ابن عباس کی یہ روایت کہ قبیلۂ جُہَینہ کی ایک عورت نے حضورؐ سے پوچھا "میری ماں نے روزے کی نذر مانی تھی اور وہ پوری کیے بغیر مرگئی، کیا میں اس کی طرف سے روزہ رکھ سکتی ہوں؟" حضورؐ نے فرمایا "اس کی طرف سے روزہ رکھ لے" (بخاری، مسلم، احمد، نسائی، ابوداؤد)۔ اور حضرت بُرَیدہ کی یہ روایت کہ ایک عورت نے اپنی ماں کے متعلق پوچھا کہ اُس کے ذمہ ایک مہینے (یا دوسری روایت کے مطابق دو مہینے) کے روزے تھے، کیا میں یہ روزے ادا کر دوں؟ آپ نے اس کو بھی اس کی اجازت دے دی (مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد)۔ اور حضرت عائشہؓ کی روایت کہ حضورؐ نے فرمایا من مات وعلیہ صیام صام عنہ ولیّہ "جو شخص مرجائے اور اس کے ذمہ کچھ روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی وہ روزے رکھ لے" (بخاری، مسلم، احمد۔ بزّار کی روایت میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ فلیصم عنہ ولیّہ ان شاء۔ یعنی اس کا ولی اگر چاہے تو اس کی طرف سے یہ روزے رکھ لے)۔ انہی احادیث کی بنا پر اصحاب الحدیث اور امام اَوزاعی اور ظاہریہ اس کے قائل ہیں کہ بدنی عبادات میں بھی نیابت جائز ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ، امام مالک، اور امام شافعی اور امام زید بن علی کا فتویٰ یہ ہے کہ میّت کی طرف سے روزہ نہیں رکھا جا سکتا، اور امام احمد، امام لَیث اور اسحاق بن راھَوَیہ کہتے ہیں کہ صرف اس صورت میں ایسا کیا جا سکتا ہے جبکہ مرنے والے نے اس کی نذر مانی ہو اور وہ اسے پورا نہ کر سکا ہو۔ مانعین کا استدلال یہ ہے کہ جن احادیث سے اس کے جواز کا ثبوت ملتا ہے ان کے راویوں نے خود اس کے خلاف فتویٰ دیا ہے ابن عباس کا

اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی اور اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی، [۹۰]

اور یہ کہ آخر کار پہنچنا تیرے رب ہی کے پاس ہے،

اور یہ کہ اسی نے ہنسایا اور اسی نے رلایا، [۹۱]

فتویٰ نسائی نے اِن الفاظ میں نقل کیا ہے کہ لا یصلی احد عن احد ولا یصم احد عن احد، "کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے اور نہ روزہ رکھے"۔ اور حضرت عائشہ کا فتویٰ عبدالرزاق کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ لاتصوموا عن موتاکم واطعموا عنھم، "اپنے مُردوں کی طرف سے روزہ نہ رکھو بلکہ کھانا کھلاؤ"۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی عبدالرزاق نے یہی بات نقل کی ہے کہ میّت کی طرف سے روزہ نہ رکھا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً بدنی عبادات میں نیابت کی اجازت تھی، مگر آخری حکم یہی قرار پایا کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ ورنہ کس طرح ممکن تھا کہ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ احادیث نقل کی ہیں وہ خود ان کے خلاف فتویٰ دیتے

اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نیابتہً کسی فریضہ کی ادائیگی صرف انہی لوگوں کے حق میں مفید ہو سکتی ہے جو خود ادائے فرض کے خواہشمند ہوں اور معذوری کی وجہ سے قاصر رہ گئے ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص استطاعت کے باوجود قصداً حج سے مجتنب رہا اور اس کے دل میں اِس فرض کا احساس تک نہ تھا، اس کے لیے خواہ کتنے ہی حج بدل کیے جائیں، وہ اس کے حق میں مفید نہیں ہو سکتے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نے کسی کا قرض جان بوجھ کر مار رکھا یا اور مرتے دم تک اس کا کوئی ارادہ قرض ادا کرنے کا نہ تھا۔ اس کی طرف سے خواہ بعد میں پائی پائی ادا کر دی جائے، اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ قرض مارنے والا ہی شمار ہو گا ——— دوسرے کے ادا کرنے سے سبکدوش صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنی زندگی میں ادائے قرض کا خواہشمند ہو اور کسی مجبوری کی وجہ سے ادا نہ کر سکا ہو۔

۹۰؎ یعنی آخرت میں لوگوں کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو گی اور یہ دیکھا جائے گا کہ کون کیا کر کے آیا ہے۔

۹۱؎ یعنی خوشی اور غم، دونوں کے اسباب اسی کی طرف سے ہیں۔ اچھی اور بُری قسمت کا سر رشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی کو اگر راحت و مسرّت نصیب ہوئی ہے تو اسی کے دینے سے ہوئی ہے۔ اور کسی کو مصائب

اور یہ کہ اسی نے موت دی اور اسی نے زندگی بخشی

اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے،[۴۱]

اور یہ کہ دوسری زندگی بخشنا بھی اسی کے ذمہ ہے،[۴۲]

اور یہ کہ اسی نے غنی کیا اور جائداد بخشی،[۴۳]

اور یہ کہ وہی شعریٰ کا رب ہے،[۴۴]

آلام سے سابقہ پیش آیا ہے تو اسی کی مشیت سے پیش آیا ہے۔ کوئی دوسری ہستی اِس کائنات میں ایسی نہیں ہے جو قسمتوں کے بنانے اور بگاڑنے میں کسی قسم کا دخل رکھتی ہو۔

۴۱۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۴۳۷ تا ۴۵۷، جلد چہارم، ص ۵۱۵

۴۲۔ اوپر کی دونوں آیتوں کے ساتھ ملا کر اس آیت کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ترتیبِ کلام سے خود بخود حیات بعد الموت کی دلیل بھی برآمد ہو رہی ہے جو خدا موت دینے اور زندگی بخشنے پر قدرت رکھتا ہے؛ اور جو خدا نطفے کی حقیر سی بوند سے انسان جیسی مخلوق پیدا کرتا ہے، بلکہ ایک ہی مادۂ تخلیق و طریقِ پیدائش سے عورت اور مرد کی دو الگ صنفیں پیدا کر دکھاتا ہے، اس کے لیے انسان کو دوبارہ پیدا کرنا کچھ دشوار نہیں ہے۔

۴۳۔ اصل میں لفظ اَقْنٰی استعمال ہوا ہے جس کے مختلف معنی اہلِ لغت اور مفسرین نے بیان کیے ہیں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ابن عباس نے اس کے معنی اَرْضٰی (راضی کر دیا) بتائے ہیں۔ عِکرِمہ نے ابنِ عباس سے اس کے معنی قَنَّعَ (مطمئن کر دیا) نقل کیے ہیں۔ امام رازی کہتے ہیں کہ آدمی کی حاجت سے زیادہ جو کچھ بھی اس کو دیا جائے وہ اِقناء ہے۔ ابو عُبَیدہ اور دوسرے متعدد اہلِ لغت کا قول ہے کہ اَقْنٰی قُنْیَۃٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں باقی اور محفوظ رہنے والا مال جیسے مکان، اراضی، باغات، مواشی وغیرہ۔ ان سب سے الگ مفہوم ابن زید بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اَقْنٰی یہاں اَفْقَرَ (فقیر کر دیا) کے معنی میں ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس نے جس کو چاہا غنی کیا اور جسے چاہا فقیر کر دیا۔

۴۴۔ شعریٰ آسمان کا روشن ترین تارا ہے جسے مِرزَم الجوزاء، الکلب الاکبر، الکلب الجبار، الشعریٰ العبور وغیرہ ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کو SIRIUS اور DOG STAR اور CANIS MAJORIS کہتے ہیں۔

اور یہ کہ اُسی نے عادِ اولیٰ[45] کو ہلاک کیا، اور ثمود کو ایسا مٹایا کہ ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑا، اور اُن سے پہلے قومِ نوحؑ کو تباہ کیا کیونکہ وہ تھے ہی سخت ظالم و سرکش لوگ، اور اوندھی گرنے والی بستیوں کو اٹھا پھینکا، پھر چھا دیا اُن پر وہ کچھ جو (تم جانتے ہی ہو کہ) کیا چھا دیا۔[46]

[47]پس اے مخاطب، اپنے رب کی کن کن نعمتوں میں تو شک کرے گا؟[48]

کہتے ہیں۔ یہ سورج سے ۲۳ گنا زیادہ روشن ہے، مگر زمین سے اس کا فاصلہ آٹھ سال نوری سے بھی زیادہ ہے اس لیے یہ سورج سے چھوٹا اور کم روشن نظر آتا ہے۔ اہلِ مصر اس کی پرستش کرتے تھے، کیونکہ اس کے طلوع کے زمانے میں نیل کا فیضان شروع ہوتا تھا، اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ یہ اُسی کے طلوع کا فیضان ہے۔ جاہلیت میں اہلِ عرب کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ یہ ستارہ لوگوں کی قسمتوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی بنا پر یہ عرب کے معبودوں میں شامل تھا، اور خاص طور پر قریش کا ہمسایہ قبیلہ خُزاعہ اس کی پرستش کے لیے مشہور تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری قسمتیں شِعریٰ نہیں بناتا بلکہ اُس کا رب بناتا ہے۔

۴۵۔ عادِ اُولیٰ سے مراد ہے قدیم قومِ عاد جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ یہ قوم جب حضرت ہودؑ کو جھٹلانے کی پاداش میں مبتلائے عذاب ہوئی تو صرف وہ لوگ باقی بچے جو اُن پر ایمان لائے تھے۔ ان کی نسل کو تاریخ میں عادِ اُخریٰ یا عادِ ثانیہ کہتے ہیں۔

۴۶۔ اوندھی گرنے والی بستیوں سے مراد قومِ لُوط کی بستیاں ہیں۔ اور "چھا دیا اُن پر جو کچھ چھا دیا" سے مراد غالباً بحرِ مُردار کا پانی ہے جو ان کی بستیوں کے زمین میں دھنس جانے کے بعد اُن پر پھیل گیا تھا اور آج تک وہ اس علاقے پر چھایا ہوا ہے۔

۴۷۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ فقرہ بھی صحفِ ابراہیم اور صحفِ موسیٰ کی عبارت کا ایک حصہ ہے اور بعض مفسرین کہتے ہیں کہ فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى پر وہ عبارت ختم ہو گئی، یہاں سے دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے۔ سیاقِ کلام کو دیکھتے ہوئے پہلا قول ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بعد کی یہ عبارت کہ "یہ ایک تنبیہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے"، اس امر کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اس سے پہلے کی تمام عبارت پچھلی تنبیہات میں سے ہے۔

یہ ایک تنبیہ ہے پہلے آئی ہوئی تنبیہات میں سے[49]۔ آنے والی گھڑی قریب آ لگی ہے[50]، اللہ کے سوا

[48] اصل میں لفظ تَتَمَارٰی استعمال ہوا ہے جس کے معنی شک کرنے کے بھی ہیں اور جھگڑنے کے بھی۔ خطاب ہر سامع سے ہے۔ جو شخص بھی اِس کلام کو سن رہا ہو اُس کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جھٹلانے اور ان کے بارے میں پیغمبروں سے جھگڑا کرنے کا جو انجام انسانی تاریخ میں ہو چکا ہے، کیا اُس کے بعد بھی تو اسی حماقت کا ارتکاب کرے گا؟ پچھلی قوموں نے یہی تو شک کیا تھا کہ جن نعمتوں سے ہم اِس دنیا میں متمتع ہو رہے ہیں یہ خدائے واحد کی نعمتیں ہیں، یا کوئی اور بھی اِن کے مہیا کرنے میں شریک ہے، یا یہ کسی کی فراہم کی ہوئی نہیں ہیں بلکہ آپ سے آپ فراہم ہو گئی ہیں۔ اسی شک کی بنا پر انہوں نے انبیاء علیہم السلام سے جھگڑا کیا تھا۔ انبیاء ان سے کہتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں تمہیں خدا نے، اور اکیلے ایک ہی خدا نے عطا کی ہیں، اس لیے اُسی کا تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے اور اُسی کی تم کو بندگی بجا لانی چاہیے۔ مگر وہ لوگ اس کو نہیں مانتے تھے اور اسی بات پر انبیاء سے جھگڑتے تھے۔ اب کیا تجھے تاریخ میں یہ نظر نہیں آتا کہ یہ قومیں اپنے اِس شک اور اِس جھگڑے کا کیا انجام دیکھ چکی ہیں؟ کیا تو بھی وہی شک اور وہی جھگڑا کرے گا جو دوسروں کے لیے تباہ کُن ثابت ہو چکا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ عاد اور ثمود اور قومِ نوح کے لوگ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے گزر چکے تھے اور قومِ لوط خود حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں مبتلائے عذاب ہوئی تھی، اس لیے اِس عبارت کے صحفِ ابراہیم کا ایک حصّہ ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

[49] اصل الفاظ ہیں هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى۔ اِس فقرے کی تفسیر میں مفسّرین کے تین اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ نذیر سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ تیسرے یہ کہ اس سے مُراد پچھلی ہلاک شدہ قوموں کا انجام ہے جس کا حال اوپر کی آیات میں بیان فرمایا گیا ہے۔ سیاقِ کلام کے لحاظ سے ہمارے نزدیک یہی تیسری تفسیر قابلِ ترجیح ہے۔

[50] یعنی یہ خیال نہ کرو کہ سوچنے سمجھنے کے لیے ابھی بہت وقت پڑا ہے، کیا جلدی ہے کہ اِن باتوں پر ہم فوراً ہی سنجیدگی کے ساتھ غور کریں اور انہیں ماننے کا بلا تاخیر فیصلہ کر ڈالیں۔ نہیں، تم میں سے کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کے لیے زندگی کی کتنی مہلت باقی ہے۔ ہر وقت تم میں سے ہر شخص کی موت بھی آسکتی ہے، اور قیامت

کوئی اس کو ہٹانے والا نہیں[۵۱]۔ اب کیا یہی وہ باتیں ہیں جن پر تم اظہار تعجب کرتے ہو؟[۵۲] ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو؟[۵۳] اور گا بجا کر انہیں ٹالتے ہو؟[۵۴] جھک جاؤ اللہ کے آگے اور بندگی بجا لاؤ[۵۵] ع ۳

بھی اچانک پیش آسکتی ہے۔ اس لیے فیصلے کی گھڑی کو دور نہ سمجھو۔ جس کو بھی اپنی عاقبت کی فکر کرنی ہے وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر سنبھل جائے۔ کیونکہ ہر سانس کے بعد یہ ممکن ہے کہ دوسرا سانس لینے کی نوبت نہ آئے۔

۵۱؎ یعنی فیصلے کی گھڑی جب آجائے گی تو نہ تم اسے روک سکو گے اور نہ تمہارے معبودانِ غیر اللہ میں سے کسی کا یہ بل بوتا ہے کہ وہ اس کو ٹال سکے۔ ٹال سکتا ہے تو اللہ ہی ٹال سکتا ہے، اور وہ اسے ٹالنے والا نہیں ہے۔

۵۲؎ اصل میں لفظ ھٰذَا الحدیث استعمال ہُوا ہے جس سے مراد وہ ساری تعلیم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے قرآن مجید میں پیش کی جا رہی تھی۔ اور تعجب سے مُراد وہ تعجب ہے جس کا اظہار آدمی کسی انوکھی اور ناقابلِ یقین بات کو سُن کر کیا کرتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ یہی کچھ ہے جو تم نے سن لی۔ اب کیا یہی وہ باتیں ہیں جن پر تم کان کھڑے کرتے ہو اور حیرت سے اس طرح مُنہ تکتے ہو کہ گویا کوئی بڑی عجیب اور نرالی باتیں تمہیں سنائی جا رہی ہیں؟

۵۳؎ یعنی بجائے اس کے کہ تمہیں اپنی جہالت و گمراہی پر رونا آتا، تم لوگ اُلٹا اس صداقت کا مذاق اُڑاتے ہو جو تمہارے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔

۵۴؎ اصل میں لفظ سَامِدُوْن استعمال ہُوا ہے جس کے دو معنی اہلِ لغت نے بیان کیے ہیں۔ ابنِ عباس، عکرمہ اور ابو عبیدہ نحوی کا قول ہے کہ یمنی زبان میں سُمُود کے معنی گانے بجانے کے ہیں، اور آیت کا اشارہ اس طرف ہے کہ کفارِ مکہ قرآن کی آواز کو دبانے اور لوگوں کی توجہ دوسری طرف ہٹانے کے لیے زور زور سے گانا شروع کر دیتے تھے۔ دوسرے معنی ابن عباس اور مجاہد نے یہ بیان کیے ہیں کہ السمود البرطمة وھی رفع الرأس تکبرًا، کانوا یمرون علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم غضبا مبرطمین یعنی سُمُود تکبر کے طور پر سر نیوڑھانے کو کہتے ہیں، کفارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے جب گزرتے تو غصے کے ساتھ منہ اوپر اٹھائے ہوئے نکل جاتے تھے۔ راغب اصفہانی نے مفردات میں بھی یہی معنی اختیار کیے ہیں، اور اسی معنی کے لحاظ سے سَامِدُوْن کا مفہوم قتادہ نے غافلون اور سعید بن جبیر نے معرضون بیان کیا ہے۔

۵۰؎ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور اکثر اہل علم کے نزدیک اس آیت پر لازماً سجدہ کرنا چاہیے۔ امام مالک اگرچہ خود اس کی تلاوت کر کے سجدے کا التزام فرماتے تھے (جیسا کہ ابن العربی نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے)، مگر ان کا مسلک یہ تھا کہ یہاں سجدہ کرنا لازم نہیں ہے۔ ان کی اس رائے کی بنا حضرت زید بن ثابت کی یہ روایت ہے کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۂ نجم پڑھی اور حضورؐ نے سجدہ نہ کیا" (بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)۔ لیکن یہ حدیث اس آیت پر سجدہ لازم ہونے کی کلی نفی نہیں کرتی، کیونکہ اس بات کا احتمال ہے کہ حضورؐ نے اُس وقت کسی وجہ سے سجدہ نہ فرمایا ہو اور بعد میں کر لیا ہو۔ دوسری روایات اس باب میں صریح ہیں کہ اس آیت پر التزاماً سجدہ کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، ابن عباس اور مُطّلِب بن ابی وَداعہ کی متفق علیہ روایات یہ ہیں کہ حضورؐ نے جب پہلی مرتبہ حرم میں یہ سورہ تلاوت فرمائی تو آپ نے سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ مسلم و کافر سب سجدے میں گر گئے (بخاری، احمد، نسائی)۔ ابن عمر کی روایت ہے کہ حضورؐ نے نماز میں سورۂ نجم پڑھ کر سجدہ کیا اور دیر تک سجدے میں پڑے رہے (بیہقی۔ ابن مَرْدُوْیَہ)۔ سَبْرۃ الجُہَنی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فجر کی نماز میں سورۂ نجم پڑھ کر سجدہ کیا اور پھر اٹھ کر سورۂ زلزال پڑھی اور رکوع کیا (سعید بن منصور)۔ خود امام مالک نے بھی مُوطّا، باب ماجاء فی سجود القرآن میں حضرت عمرؓ کا یہ فعل نقل کیا ہے۔

خطبۂ عید الفطر

[یہ وہ تقریر ہے جو یکم شوال کو بروز جمعہ عید الفطر کے موقع پر گلبرگ ۔ لاہور کے اجتماع عید میں کی گئی تھی ۔]

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدِ الَّذِیْ اَرْسَلَہٗ بِالْھُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ ۔

حضرات ! قبل اس کے کہ میں آپ کی خدمت میں عید کے متعلق کچھ عرض کروں ، یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ رویتِ ہلال کے معاملے میں کل جو صورت پیش آئی ہے اس کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کروں ۔ اس لیے کہ کل عید کے قبول نہ کیے جانے کی ذمہ داری میں میں بھی شریک ہوں ۔

اس معاملے میں سب سے پہلے دو اصولی باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہییں ۔

اوّل یہ کہ اگر کوئی واقعہ ایسی حالت میں پیش آئے جب کہ کثیر تعداد دیکھنے والوں کی موجود ہو تو ایسی صورت میں دو چار آدمیوں کا یہ کہنا کہ واقعہ اِس شکل میں پیش آیا درآنحالیکہ ہزاروں آدمی جو موجود تھے انہوں نے اس کو نہیں دیکھا ، قابلِ قبول نہیں ہو سکتا ۔ البتہ اگر واقعہ کسی بند کمرے میں پیش آیا ہو جہاں دو تین ہی آدمی دیکھنے والے ہوں تو اُس صورت میں ان کی شہادت قابلِ غور ہو سکتی ہے ۔ اس حالت میں واقعہ کی تحقیق کے لیے ان کی شہادت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی جس پر انحصار کیا جا سکے ۔ اور ان کی شہادت کو رد یا قبول کرنے کے لیے بس یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ گواہ جھوٹے ہیں یا سچے ، اور ان کا کوئی خاص مفاد تو واقعہ کو اس شکل میں بیان کرنے سے وابستہ نہیں ہے ، اور ان کی شہادتوں میں کوئی ایسا تناقض تو نہیں ہے جس کی بنا پر وہ قابلِ قبول نہ ہوں ۔ اگر وہ سچے لوگ ہوں ، اور ان کا ذاتی مفاد بھی اس معاملہ سے متعلق نہ ہو ، اور

ان کے بیانات میں تناقض بھی نہ ہو، تو ان کے قول کو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اب دیکھیے کہ چاند کا آسمان پر نکلنا اگر مطلع صاف ہو تو اس کے دیکھنے والے لاکھوں آدمی ہوتے ہیں۔ اس کا فیصلہ دو چار یا چند آدمیوں کی شہادت پر نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ آسمان پر جو چیز نمایاں ہو اسے لاکھوں آدمی تو نہ دیکھ سکیں اور بس دو چار یا دس پانچ آدمی دیکھ لیں۔ البتہ اگر مطلع صاف نہ ہو اور بادل فضا پر چھائے ہوئے ہوں، اس صورت میں دو چار آدمی اگر یہ بیان کریں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے تو ان کی یہ شہادت قابلِ غور ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بدلی کہیں سے ہٹی ہو اور کسی کو چاند نظر آ گیا ہو۔ اس صورت میں صرف یہی دیکھنا ہو گا کہ یہ لوگ سچے ہیں یا نہیں اور خود روزے نماز کے پابند ہیں یا نہیں۔ کیونکہ جو شخص خود روزے نماز کا پابند نہ ہو اسے اس بات کی کیا فکر ہو سکتی ہے کہ لوگوں کے روزے ٹوٹیں یا رہیں۔ لہٰذا اگر ایسے بھروسے کے قابل آدمی شہادت دیں تو اُن کی شہادت پر رویتِ ہلال کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔

دوسری اصولی بات جو آپ کے ذہن میں اچھی طرح سے صاف ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ رویتِ ہلال کے معاملے میں پہلے مرحلے پر شہادت درکار ہوتی ہے اور دوسرے مرحلے پر صرف خبر کافی ہو جاتی ہے یعنی سب سے پہلے اس امر کی شہادت قائم ہونی چاہیے کہ چاند ایسے چند آدمیوں نے دیکھا ہے جو بھروسے کے قابل تھے۔ کسی معتبر مجلس یا کسی مفتی یا قاضی نے یہ شہادتیں لی ہوں۔ ان شہادتوں کی بنا پر جب وہ مطمئن ہو کر رویتِ ہلال کا اعلان کر دے، تو اس کے بعد یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہر ایک آدمی یا تو خود چاند دیکھے یا اس کے سامنے شہادتیں پیش ہوں۔ بلکہ مجلسِ مجاز یا مفتی یا قاضی کے اعلان کی بنا پر اگر سائرن بجیں یا نقارے بجیں یا شہر میں عام چرچا ہو کہ چاند دیکھا گیا تو عام لوگوں کے لیے یہ خبر کافی ہے۔

ان دو اصولی باتوں کو سمجھ لینے کے بعد اب دیکھیے کہ گزشتہ بدھ کو یہاں کیا صورتِ حال پیش آئی ہے۔ اس روز آپ جانتے ہیں کہ لاہور شہر میں مطلع صاف تھا۔ لاکھوں آدمی چاند دیکھنے والے موجود تھے، مگر پورے شہر میں کسی نے چاند نہیں دیکھا تھا۔ پونے آٹھ بجے خبروں میں یہ اعلان کیا گیا کہ چاند دیکھ لیا گیا ہے، کل عید ہو گی۔ مگر اس میں کوئی صراحت اس امر کی نہیں تھی کہ چاند کہاں دیکھا گیا اور

کیا شہادت اس کے دیکھے جانے کی قائم ہوئی ۔ یہ خبر سننے کے بعد دلوں میں شبہات پیدا ہوئے اور میں بھی پریشانی میں مبتلا ہو گیا ۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ لاہور میں لاکھوں آدمی آسمان پر آنکھیں لگائے ہوئے ہوں، مطلع بھی صاف ہو اور پھر یہاں تو چاند نظر نہ آئے اور دوسری کسی جگہ دیکھ لیا جائے ۔ یہ خبر سننے کے بعد میں نے مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں خود بھی ٹیلیفون کیے اور مغربی پاکستان کے مختلف حصوں سے میرے پاس بھی ٹیلیفون مسلسل آنے شروع ہوئے ۔ کراچی، نوابشاہ، صادق آباد، رحیم یار خاں، خان پور، ملتان، سرگودھا، حافظ آباد، گجرات، گوجرانوالہ، نارووال، سیالکوٹ، لالہ موسیٰ، راولپنڈی، غرض مختلف مقامات سے یہ خبر ملی کہ ہر جگہ مطلع صاف تھا مگر چاند کہیں نہیں دیکھا گیا ۔ اس کے بعد یہ اطلاعات آنی شروع ہوئیں کہ ملتان میں، سرگودھا میں، لائل پور میں، گجرات میں، گوجرانوالہ میں، حافظ آباد میں، اور بعض دوسرے مقامات پر علماء نے یہ رائے قائم کی ہے کہ چاند نکلنے کا کوئی قابلِ اطمینان ثبوت بہم نہیں پہنچا اس وجہ سے کل عید نہیں ہوگی بلکہ روزہ رکھا جائے گا ۔ میرا خود بھی اس معاملے میں پورا اطمینان ہو گیا کہ چاند نکلنے کا ثبوت بہم نہیں پہنچا ہے

ریڈیو پر جو اطلاعات بعد میں دی گئیں وہ یہ تھیں کہ مالاکنڈ، مردان، پشاور اور کوہاٹ میں چاند دیکھا گیا ہے لیکن ان میں بھی اس بات کی صراحت نہیں تھی کہ آیا وہاں مطلع صاف تھا یا نہیں ۔ اگر مطلع صاف تھا تو کیا وہاں جمِ غفیر نے دیکھا ہے؟ اگر مطلع صاف نہیں تھا تو کیا وہاں شرعی طریقے سے شہادت بہم پہنچی ہے اور اس کی بنا پر یہ فیصلہ دیا جا رہا ہے؟ ان امور کی صراحت نہ ہونے کی صورت میں یہ بات باور کرنے کے قابل نہیں تھی کہ کراچی سے لے کر راولپنڈی تک مطلع صاف ہو، لاکھوں آدمی جگہ جگہ آسمان کی طرف نگاہ لگائے ہوئے ہوں اور کہیں ان کو چاند نظر نہ آئے مگر مالاکنڈ میں وہ نظر آجائے، یا مردان یا پشاور میں لوگ اسے دیکھ لیں ۔ مزید شبہ پیدا کرنے والی بات یہ تھی کہ جس علاقے کا حوالہ دیا جا رہا ہے وہاں برسوں سے پاکستان کے باقی تمام علاقوں سے مختلف ایام میں روزے شروع بھی کیے جاتے رہے ہیں اور عید بھی کی جاتی رہی ہے ۔ اب بھی ۱۲ ؍جنوری کے پاکستان ٹائمز میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ مردان اور چارسدہ کے بعض مقامات پر بدھ کے روز عید کی گئی ہے ۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے یہ بات کسی طرح بھی قابلِ قبول

نہ ہو سکتی تھی کہ جمعرات کو عید کی جائے۔ دینی حیثیت سے یہ معاملہ بڑا نازک ہے۔ اگر رویت ہلال ثابت نہ ہو اور ہم روزہ چھوڑ کر عید منالیں تو گناہ عظیم ہے اور اگر رویت ثابت ہو اور ہم عید کرنے کے بجائے روزہ رکھ لیں تو گناہ عظیم ہے۔ اور یہ کسی ایک شخص کا انفرادی معاملہ بھی نہیں ہے بلکہ ایک پوری قوم کے کروڑوں آدمیوں کا معاملہ ہے۔ اس میں تساہل سے کیسے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں ہماری یہ ذمہ داری تھی کہ ہم ملک کے لوگوں کو خبردار کر دیں کہ رویتِ ہلال کی کوئی قابلِ اطمینان شہادت قائم نہیں ہوئی ہے، اس لیے لوگ جمعرات کا روزہ رکھیں اور عید نہ کریں۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ ملک کے لوگوں کو خبر کرنے کا نہیں تھا۔ ریڈیو کو ہم استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اخبارات میں عام اعلان بھی نہیں کرا سکتے تھے۔ صرف ایک اخبار نے یہ جرأت کی کہ میرا پورا بیان شائع کر دیا۔ شہر میں مساجد کے لاؤڈ اسپیکروں سے بھی اعلان کم ہی کیا جا سکا۔ اسی وجہ سے وہ افراتفری رونما ہوئی جو کل دیکھی گئی ہے۔

جمعرات کی شام کو جو چاند دیکھا گیا ہے اس نے حقیقتِ حال کو سارے ملک کے سامنے کھول دیا ہے۔ کوئی شخص بھی اس چاند کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دوسری تاریخ کا چاند تھا۔ اگر ۲۹ کو چاند ہو چکا ہوتا تو لازماً یہ دوسری تاریخ کا چاند ہونا چاہیے تھا۔ کیا دوسری تاریخ کا چاند بھی کسی نے ایسا باریک اور دھندلا دیکھا ہے؟ اب بعض لوگ یہ سوال کر رہے ہیں کہ اگر یہ ۳۰ کا چاند تھا تو زیادہ دیر تک کیسے نظر آتا رہا؟ ان حضرات کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ۲۹ تاریخ کا چاند تھوڑی دیر کے لیے نظر آتا ہے اور جلدی غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ۳۰ کا چاند خاصی دیر تک ٹھہرتا ہے۔ لیکن ۳۰ کا چاند ایسا دھندلا ہوتا ہے کہ آسمان پر اس کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ تلاش کے بغیر وہ نظر نہیں آتا۔ اور دوسری تاریخ کا چاند خود سامنے موجود ہوتا ہے، اس کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

یہ ہے اس معاملے میں صحیح صورتِ حال۔ ہمارے لیے یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ حکومت پاکستان نے ایک مسلمان حکومت کا فرض ادا کرنے کی کوشش کی اور رویت ہلال کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لیا۔ ہم تو خود چاہتے تھے کہ وہ ان فرائض کو ادا کرے جو ایک مسلمان حکومت پر عائد ہوتے ہیں۔ لیکن اس کام کے لیے جو انتظام اس نے کیا ہے وہ قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے پچھلے سال بھی عید میں گڑبڑ

ہوئی تھی جس کا خود حکومت کو اعتراف کرنا پڑا۔ اب اس سال جو صورتِ حال پیش آئی ہے اس نے رویتِ ہلال کے موجودہ سرکاری انتظام کو اس حد تک ناقابلِ اطمینان ثابت کر دیا ہے کہ آئندہ اس کے اعلانات پر کوئی اعتماد نہ کیا جا سکے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اس طریقہ کو فوراً تبدیل کر دیا جائے۔ رویت کے انتظام کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہر ضلع میں رویتِ ہلال کمیٹیاں بنائی جائیں جن کے اندر ایسے قابلِ اعتماد علماء کو شامل کیا جائے جن کی دیانت پر لوگوں کو عام طور پر اعتماد ہو۔ اسی طرح سے مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی میں بھی ایسے لوگوں کو شامل کیا جائے جو اپنے دین اور اخلاق کے لحاظ سے لوگوں میں عام طور پر قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہیں۔ یہ تمام کمیٹیاں اس امر کا پورا اہتمام کریں کہ جس روز عید کا چاند ہونے کا احتمال ہو اس روز شرعی طریقے سے رویت ہونے یا نہ ہونے کا پورا ثبوت بہم پہنچا کر مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی کو اس کی اطلاع کریں۔ مرکزی کمیٹی ریڈیو پر تفصیل کے ساتھ یہ بیان نشر کرے کہ کن ذرائع معلومات کی بنا پر وہ چاند ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کر رہی ہے۔ اس رپورٹ کو خود کمیٹی ہی کا کوئی ذمہ دار آدمی ریڈیو پر آ کر ملک کے سامنے پیش کرے۔ محض کسی اناؤنسر کے ذریعہ سے یہ سنا دینا کہ چاند دیکھ لیا گیا ہے، ہرگز قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ یہ طریقِ کار اختیار کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ عید پر ملک میں افراتفری برپا ہو سکے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور توضیح طلب ہے جسے صاف کر دینا ضروری ہے۔ بعض حلقے یہ خیال بڑے زور شور سے پھیلا رہے ہیں کہ عید اسلامی اتحاد کا ایک اہم نشان ہے، اس لیے تمام مسلمانوں کی عید لازماً ایک دن ہونی چاہیے۔ ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی عید ایک دن ہو۔ اور کچھ دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ پاکستان کے تمام مسلمانوں کی عید تو ایک ہی دن ہونی ضروری ہے لیکن درحقیقت یہ فکر و نظر کی غلطی ہے، دین سے ناواقفیت کی بنا پر ایسی باتیں کی جا رہی ہیں، اور یہ باتیں زیادہ تر وہ لوگ کر رہے ہیں جو رمضان کے روزے تو نہیں رکھتے مگر عید کے معاملے میں اسلامی اتحاد کی انہیں بڑی فکر ہے۔

ان حضرات کو پہلی غلط فہمی تو یہ لاحق ہے کہ عید اُن کے نزدیک کرسمس یا ہولی یا دیوالی کی طرح کوئی تہوار ہے۔ یا پھر یہ کوئی قومی جشن ہے جسے مسلمانوں کے قومی اتحاد کا نشان بنایا گیا ہے۔ حالانکہ دراصل عید کا تعلق

ایک عبادت سے ہے جو رمضان کے آغاز سے شروع ہوتی ہے اور رمضان کے خاتمہ کے بعد اللہ تعالیٰ کے شکر کے طور پر دو رکعت نماز پڑھ کر ختم کی جاتی ہے۔ شریعت کے صریح احکام کی رُو سے اس عبادت کا آغاز اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک قابلِ اطمینان طریقہ سے یہ معلوم نہ ہو کہ رمضان شروع ہو چکا ہے، اور اس کا اختتام بھی اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ایسے ہی قابلِ اطمینان طریقہ سے یہ علم نہ ہو جائے کہ رمضان ختم ہو چکا ہے۔ قرآن مجید کا صاف حکم ہے کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ ... ... فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ " رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے ... پس تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے (یا اس میں موجود ہو) وہ اس کے روزے رکھے" یہ آیت قطعی طور پر اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ رمضان کا مہینہ جب سے شروع ہو اور جب تک وہ رہے، ہر مسلمان کو اس کے روزے رکھنے چاہییں، اور اس مہینے کے روزوں کی تکمیل کیے بغیر کسی عید کا ہرگز کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا اس معاملہ میں اصل چیز مسلمانوں کا اتحاد نہیں ہے بلکہ ماہ رمضان کا اختتام ہے جس کا اطمینان حاصل کرنا عید کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ رمضان ایک قمری مہینہ ہے جس کا انحصار رویتِ ہلال پر ہے۔ اور اس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت موجود ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی روزے ختم کرو، لیکن اگر مطلع صاف نہ ہو تو تیس روزوں کی تعداد پوری کرو، الّا یہ کہ دو قابلِ اعتماد گواہ یہ شہادت دیں کہ انہوں نے چاند دیکھا ہے۔ حضورؐ نے اس ارشاد میں دو باتیں صاف صاف متعین فرما دی ہیں۔ ایک یہ کہ رویت کی شہادت اُس وقت درکار ہو گی جبکہ مطلع صاف نہ ہو، دوسرے یہ کہ اس صورت میں خبر پر نہیں بلکہ دو عادل گواہوں کی شہادت پر رویت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اور شہادت کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ تار یا ٹیلیفون یا ریڈیو پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے گواہوں کا سامنے موجود ہونا ضروری ہے۔ آپ کسی عدالت کو ٹیلیفون پر شہادت دے کر دیکھیں۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ شہادت قابلِ قبول ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس ٹیلیفونی "شہادت" کو دنیا کی کوئی عدالت نہیں مان سکتی، آخر ہم سے کیوں چاہا جاتا ہے کہ ہم ایک ایسے اہم شرعی معاملے میں اس پر اعتماد کریں جس پر کروڑوں مسلمانوں کے روزے ٹوٹنے یا قائم رہنے کا انحصار ہے؟

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی عید ایک دن ہونی چاہیے وہ تو بالکل ہی لغو بات کہتے ہیں کیونکہ تمام دنیا میں رویتِ ہلال کا لازماً اور ہمیشہ ایک ہی دن ہونا ممکن نہیں ہے۔ رہا کسی ایک ملک یا کسی ایک بڑے علاقے میں سب مسلمانوں کی ایک عید ہونے کا مسئلہ تو شریعت نے اس کو بھی لازم نہیں کیا ہے۔ یہ اگر ہو سکے اور کسی ملک میں شرعی قواعد کے مطابق رویت کی شہادت اور اس کے اعلان کا انتظام کر دیا جائے تو اس کو اختیار کرنے میں کوئی مضایقہ بھی نہیں ہے، مگر شریعت کا یہ مطالبہ ہرگز نہیں ہے کہ ضرور ایسا ہی ہونا چاہیے، اور نہ شریعت کی نگاہ میں یہ کوئی بُرائی ہے کہ مختلف علاقوں کی عید مختلف دنوں میں ہو۔ خدا کا دین تمام انسانوں کے لیے ہے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ آج آپ ریڈیو کی موجودگی کی بنا پر یہ باتیں کر رہے ہیں کہ سب کی عید ایک دن ہونی چاہیے۔ مگر آج سے ساٹھ ستر برس پہلے تک پورے برعظیم ہند تو درکنار، اس کے کسی ایک صوبے میں بھی یہ ممکن نہ تھا کہ ۲۹ رمضان کو عید کا چاند دیکھ لیے جانے کی اطلاع سب مسلمانوں تک پہنچ جاتی۔ اگر شریعت نے عید کی وحدت کو لازم کر دیا ہوتا تو پچھلی صدیوں میں مسلمان اِس حکم پر آخر کیسے عمل کر سکتے تھے؟ پھر آج بھی اس کو لازم کر کے عید کی یہ وحدت قائم کرنا عملاً ممکن نہیں ہے۔ مسلمان صرف بڑے شہروں اور قصبوں ہی میں نہیں رہتے۔ دور دراز دیہات میں بھی رہتے ہیں، اور بہت سے مسلمان جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی مقیم ہیں۔ وحدتِ عید کو ایک لازمی شرعی حکم بنانے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان ہونے کے لیے ملک میں صرف ایک ریڈیو اسٹیشن کا ہونا ہی ضروری نہ ہو، بلکہ ہر شخص کے پاس، یا ہر گھر کے لوگوں کے پاس، یا مسلمانوں کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بستی میں ایک ریڈیو سیٹ یا ایک ٹرانزسٹر بھی ضرور ہو، ورنہ وہ اپنے شرعی فرائض ادا نہ کر سکیں۔ کیا یہ آلات بھی اب دین کا ایک لازمی جُز قرار پائیں گے؟ خدا کی شریعت نے تو ایسے قواعد مقرر کیے ہیں جن سے ہر مسلمان کے لیے ہر حالت میں دینی فرائض ادا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس نے نماز کے اوقات گھڑیوں کے حساب سے مقرر نہیں کیے کہ گھڑی ہر مسلمان کے لیے اس کے دین کا ایک جُز بن جائے، بلکہ اس نے سورج کے طلوع و غروب اور زوال جیسے عالمگیر مناظر کو اوقاتِ نماز کی علامت قرار دیا جنھیں ہر شخص ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح اس نے روزے شروع اور ختم کرنے کے لیے بھی رمضان اور شوال کے چاند کی رویت کو علامت قرار دیا ہے جو عالمگیر مشاہدے کی چیز ہے

اور ہر مسلمان ہر جگہ چاند دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ اب رمضان شروع ہوا اور اب ختم ہو گیا۔ اگر وہ اس کی بنیاد جنتری کے حساب کو قرار دیتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہر مسلمان کے لیے یا تو فلکیات اور علمِ نجوم کا علم حاصل کرنا فرض ہو جاتا، یا جنتری اس کے دین کا ایک جزبن جاتی جسے پاس رکھے بغیر وہ فرائض دینی ادا نہ کر سکتا۔ اور اگر وہ یہ حکم دیتا کہ ایک جگہ کی رؤیت سے ساری دنیا میں، یا روئے زمین کی ایک ایک اقلیم میں روزے شروع اور ختم کرنا فرض ہے، تو خبر رسانی کے موجودہ ذرائع کی ایجاد سے پہلے تو مسلمان اس دین پر عمل کر ہی نہیں سکتے تھے، رہا ان کی ایجاد کے بعد کا دور تو اس میں بھی مسلمانوں پر یہ مصیبت نازل ہو جاتی کہ چاہے انہیں روٹی اور کپڑا میسر ہو یا نہ ہو، مگر وہ مسلمان رہنا چاہیں تو ان کے پاس ایک ٹرانزسٹر ضرور ہو۔

حضرات! اس مسئلے کی ضروری توضیح کے بعد اب میں آپ کو اور اپنے تمام مسلمان بھائیوں کو عید کی مبارکباد دیتا ہوں۔ عید کی مبارکباد کے حقیقی مستحق وہ لوگ ہیں جنہوں نے رمضان المبارک میں روزے رکھے، قرآن مجید کی ہدایت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی فکر کی، اس کو پڑھا سمجھا، اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی، اور تقویٰ کی اُس تربیت کا فائدہ اٹھایا جو رمضان المبارک ایک مومن کو دیتا ہے۔ قرآن مجید میں رمضان کے روزوں کی دو ہی مصلحتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ان سے مسلمانوں میں تقویٰ پیدا ہو۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ "تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو"۔ دوسری یہ کہ مسلمان اُس نعمت کا شکر ادا کریں جو اللہ تعالیٰ نے رمضان میں قرآن مجید نازل کر کے ان کو عطا کی ہے۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ "تاکہ تم اللہ کی تکبیر کرو اور اس کا شکر ادا کرو اُس ہدایت پر جو اُس نے تمہیں دی ہے"۔

دنیا میں اللہ جل شانہٗ کی سب سے بڑی نعمت نوعِ انسانی پر اگر کوئی ہے تو وہ قرآن مجید کو نازل کرنا ہے۔ تمام نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہے۔ اس لیے کہ رزق اور اس کے جتنے ذرائع ہیں، مثلاً یہ ہوا اور پانی اور یہ غلّے، اور اسی طرح معیشت کے جو ذرائع ہیں، جن سے انسان اپنے لیے روزی کماتا ہے، مکان بناتا ہے، کپڑے فراہم کرتا ہے، یہ ساری چیزیں بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہی ہیں، لیکن یہ فضل و احسان

اور اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں محض انسان کے جسم کے لیے ہیں ۔ قرآن مجید وہ نعمت ہے جو انسان کی روح کے لیے، اُس کے اخلاق کے لیے ، اور درحقیقت اُس کی اصل انسانیت کے لیے نعمتِ عظمیٰ ہے ۔ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کا شکر اسی صورت میں صحیح طور پر بجا لا سکتا ہے جبکہ وہ اس کے دیئے ہوئے رزق پر بھی شکر ادا کرے اور اس کی دی ہوئی اس نعمتِ ہدایت کے لیے بھی شکر ادا کرے جو قرآن کی شکل میں اس کو دی گئی ہے ۔ اس کا شکر ادا کرنے کی یہ صورت نہیں ہے کہ آپ بس زبان سے شکر ادا کر دیں اور کہیں کہ اللہ تیرا شکر کہ تو نے قرآن ہمیں دیا بلکہ اس کے شکر کی صحیح صورت یہ ہے کہ آپ قرآن کو سرچشمۂ ہدایت سمجھیں ، دل سے اس کو رہنمائی کا اصل مرجع مانیں اور عملاً اس کی رہنمائی کا فائدہ اٹھائیں ۔

قرآن مجید آپ کو اپنی ذاتی زندگی کے متعلق ہدایت دیتا ہے کہ آپ کس طرح سے ایک پاکیزہ زندگی بسر کریں ۔ وہ آپ کو اُن چیزوں سے منع کرتا ہے جو آپ کی شخصیت کے نشوونما کے لیے نقصان دہ ہیں ۔ وہ آپ کو وہ چیزیں بتاتا ہے جن پر آپ عمل کریں تو آپ کی شخصیت صحیح طور پر نشوونما پائے گی اور آپ ایک اچھے انسان بن سکیں گے ۔ وہ آپ کی اجتماعی زندگی کے متعلق بھی مفصل ہدایات آپ کو دیتا ہے ۔ آپ کی معاشی زندگی کیسی ہو ۔ آپ کے گھر کی زندگی کیسی ہو ۔ آپ کے تمدن اور آپ کی تہذیب کا نقشہ کیا ہو ۔ آپ کی ریاست کن طریقوں پر چلے ۔ آپ کا قانون کیا ہو ۔ آپ کی معاشی زندگی کا نظام کیسا ہو ۔ کن طریقوں سے آپ اپنی روزی حاصل کریں کن راہوں میں آپ اپنی کمائی ہوئی دولت کو خرچ کریں اور کن راہوں میں نہ کریں ۔ آپ کا تعلق اپنے خدا کے ساتھ کیسا ہو ۔ آپ کا تعلق خود اپنے نفس کے ساتھ کیسا ہو ۔ آپ کا تعلق خدا کے بندوں کے ساتھ کیسا ہو ۔ اپنی بیوی کے ساتھ ، اپنی اولاد کے ساتھ ، اپنے والدین کے ساتھ ، اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اپنے معاشرے کے افراد کے ساتھ ، اور دنیا کے تمام انسانوں کے ساتھ ، حتیٰ کہ جمادات اور حیوانات کے ساتھ اور خدا کی دی ہوئی تمام مختلف نعمتوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ کیسا ہونا چاہیے ۔ زندگی کے ان سارے معاملات کے لیے قرآن مجید آپ کو واضح ہدایات دیتا ہے ۔ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اُس کو اصل سرچشمۂ ہدایت مانے ، رہنمائی کے لیے اُسی کی طرف رجوع کرے ، اُن احکام و ہدایات اور اُن اصولوں کو صحیح تسلیم کرے جو وہ دے رہا ہے ، اور اُن کے خلاف جو چیز بھی ہو اُس کو رد کر دے خواہ وہ کہیں سے آ رہی ہو ۔ اگر کسی شخص نے اس

رمضان المبارک کے زمانے میں قرآن کو اس نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے اور کوشش کی ہے کہ اُس کی تعلیم و ہدایت کو زیادہ سے زیادہ اپنی سیرت و کردار میں جذب کرے، تو اس نے واقعی اس نعمت پر اللہ کا صحیح شکر ادا کیا ہے۔ وہ حقیقت میں اس پر مبارک باد کا مستحق ہے کہ رمضان المبارک کا ایک حق جو اُس پر تھا اسے اُس نے ٹھیک ٹھیک ادا کر دیا۔

رمضان المبارک کے روزوں کا دوسرا مقصد جس کے لیے وہ آپ پر فرض کیے گئے ہیں، یہ ہے کہ آپ کے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ آپ اگر روزے کی حقیقت پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ کارگر ذریعہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ تقویٰ کیا چیز ہے؟ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچے اور اُس کی فرمانبرداری اختیار کرے۔ روزہ مسلسل ایک مہینے تک آپ کو اسی چیز کی مشق کراتا ہے۔ جو چیزیں آپ کی زندگی میں عام طور پر حلال ہیں وہ بھی اللہ کے حکم سے روزے میں حرام ہو جاتی ہیں اور اُس وقت تک حرام رہتی ہیں جب تک اللہ ہی کے حکم سے وہ حلال نہ ہو جائیں۔ پانی جیسی چیز جو ہر وقت ہر حال میں حلال و طیب ہے، روزے میں جب اللہ حکم دیتا ہے کہ یہ اب تمہارے لیے حرام ہے تو آپ اس کا ایک قطرہ تک حلق سے نہیں اتار سکتے خواہ پیاس سے آپ کا حلق چٹخنے ہی کیوں نہ لگے، البتہ جب اللہ پینے کی اجازت دے دیتا ہے اُس وقت آپ اُس کی طرف اس طرح لپکتے ہیں گویا کسی نے آپ کو باندھ رکھا تھا اور ابھی ابھی آپ کھولے گئے ہیں۔ ایک مہینے تک بار بار یہ باندھنے اور کھولنے کا عمل اسی لیے کیا جاتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی پوری پوری بندگی و اطاعت کے لیے تیار ہو جائیں۔ جس جس چیز سے وہ آپ کو روکتا ہے اُس سے رُکنے کی، اور جس جس چیز کا وہ آپ کو حکم دیتا ہے اس کو بجا لانے کی آپ کو عادت ہو جائے۔ آپ اپنے نفس پر اتنا قابو پالیں کہ وہ اپنے بے جا مطالبات اللہ کے قانون کے خلاف آپ سے نہ منوا سکے۔ یہ غرض ہے جس کے لیے روزے آپ پر فرض کیے گئے ہیں۔

اگر کسی شخص نے رمضان کے زمانے میں روزے کی اس کیفیت کو اپنے اندر جذب کیا ہے تو وہ حقیقت میں مبارکباد کا مستحق ہے۔ اور اس سے زیادہ مبارکباد کا مستحق وہ شخص ہے جو مہینہ بھر کی اس

تربیت کے بعد عید کی پہلی ساعت ہی میں اسے اپنے اندر سے اُگل کر پھینک نہ دے بلکہ باقی گیارہ مہینے اس کے اثرات کا فائدہ اٹھاتا رہے۔ آپ غور کیجیے، اگر ایک شخص اچھی سے اچھی غذا کھائے جو انسان کے لیے نہایت قوت بخش ہو، مگر کھانے سے فارغ ہوتے ہی حلق میں انگلی ڈال کر اس کو فوراً اُگل دے تو اُس غذا کا کوئی فائدہ اُسے حاصل نہ ہوگا، کیونکہ اس نے ہضم ہونے اور خون بنانے کا اسے کوئی موقع ہی نہ دیا۔ اس کے برعکس اگر ایک شخص غذا کھا کر اسے ہضم کرے اور اس سے خون بن کر اُس کے جسم میں دوڑ سے، تو یہ کھانے کا اصل فائدہ ہے جو اس نے حاصل کیا۔ کم درجے کی مقوی غذا کھا کر اُسے جزوِ بدن بنانا اِس سے بہتر ہے کہ بہترین غذا کھانے کے بعد استفراغ کر دیا جائے۔ ایسا ہی معاملہ رمضان کے روزوں کا بھی ہے۔ ان کا حقیقی فائدہ آپ اِسی طرح اٹھا سکتے ہیں کہ ایک مہینے تک جو اخلاقی تربیت اِن روزوں نے آپ کو دی ہے عید کے بعد آپ اس کو نکال کر اپنے اندر سے پھینک نہ دیں، بلکہ باقی گیارہ مہینے اس کے اثرات کو اپنی زندگی میں کام کرنے کا موقع دیں۔ یہ فائدہ اگر کسی شخص نے اس رمضان سے حاصل کر لیا تو وہ واقعی پوری پوری مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت پا لی۔

ہمارے اندر بدقسمتی سے ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جو رمضان کے زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ رمضان آتا ہے اور گزر جاتا ہے مگر ان کے گھروں میں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہاں کچھ مسلمان بستے ہیں جن کے لیے یہ مہینہ کوئی خاص معنی رکھتا ہے۔ روزہ رکھنا تو درکنار، اس کا احترام کرنے کی توفیق بھی ان کو نصیب نہیں ہوتی۔ رمضان کے زمانے میں وہ اسی طرح اطمینان سے کھاتے اور پیتے رہتے ہیں جیسے کوئی عیسائی یا ہندو یا سکھ کھاتا پیتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ یہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں ان کی مثال اس بنجر زمین کی سی ہے جس کے اندر بارش کا موسم آنے پر بھی، جب کہ ہر طرف سبزہ زار پھیلا ہوتا ہے اور کھیتیاں پھلتی اور پھولتی ہیں، گھاس کا ایک تنکا تک پیدا نہیں ہوتا۔ بارش کا زمانہ جس طرح زمین کے لیے روئیدگی کا موسم ہے، ٹھیک اسی طرح رمضان المبارک روحِ اسلام کے لیے بالیدگی کا موسم ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے روزے کا

حکم اس شکل میں دیا ہوتا کہ مسلمانوں میں سے ہر شخص جب چاہے روزے رکھ کر تیس روزوں کی تعداد پوری کر لیا کرے تو ہماری دینی زندگی میں یہ موسم کی سی کیفیت کبھی پیدا نہ ہو سکتی تھی لیکن اس حکیم مطلق نے حکم اس شکل میں دیا کہ تمام مسلمان ایک ہی مہینے میں ایک ساتھ روزے رکھیں۔ اس چیز نے موسم کی سی کیفیت پیدا کر دی موسم جب آتا ہے تو اعلیٰ درجے کی زرخیز زمینوں کو چھوڑیئے، جس زمین میں کچھ بھی روئیدگی کی صلاحیت ہوتی ہے اس کے اندر سے بھی سبزی کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں کیونکہ موسم کی برکت یہی ہے کہ روئیدگی کی ادنیٰ سے ادنیٰ صلاحیت رکھنے والی زمین بھی اس کے فیض سے محروم نہیں رہتی، اور جو زمین موسم آنے پر بھی ایک کونپل تک نہ نکالے اس کی یہ کیفیت اس بات کی صریح علامت ہوتی ہے کہ وہ قوتِ نمو سے بالکل خالی ہے۔ اسی طرح رمضان ایک ایسا زمانہ ہے کہ جس مسلمان کے اندر ایمان کی ایک رمق اور اسلام کا کوئی ذرہ برابر جذبہ بھی موجود ہو، وہ گیارہ مہینے خواہ کیسا ہی بے حس رہا ہو، اس مہینے کے آتے ہی اس کے اندر کا سویا ہوا ایمان کروٹیں لینے لگتا ہے ایک مہینے تک تمام مسلمانوں کا بیک وقت سحری کے لیے اٹھنا، سب کا ایک ساتھ دن بھر روزے رکھنا، ایک ہی وقت میں سب کا افطار کرنا، اور راتوں کو جگہ جگہ تراویح پڑھنا مسلمانوں کی بستیوں میں ایک زبردست اجتماعی ماحول پیدا کر دیتا ہے جس کی برکت سے مسجدیں بھر جاتی ہیں، ہر طرف تلاوتِ قرآن کا چرچا ہونے لگتا ہے، وہ لوگ بھی نمازیں پڑھنے لگتے ہیں جو دوسرے دنوں میں نماز کے پابند نہیں ہوتے، اور وہ لوگ بھی روزے رکھنے لگتے ہیں جن کے اندر دوسرے دنوں میں دین سے کوئی خاص لگاؤ نہیں پایا جاتا۔ اس ماحول میں بھی اگر کوئی شخص بالکل غیر متأثر رہتا ہے، خدا کی طرف کوئی رجوع اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا، نماز روزے اور تلاوتِ قرآن کے لیے کوئی رغبت اس کے دل میں نہیں اُبھرتی تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کا دل جذبۂ ایمانی سے قطعاً خالی ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا ہے۔ خدا اور اس کے دین کے ساتھ، اور مسلمانوں کی ملت کے ساتھ جتنے روابط ہو سکتے تھے، ان سب کو اس نے کاٹ پھینکا ہے۔ اس کے بعد آپ کیا بھروسہ کر سکتے ہیں کہ جو آدمی مسلمانوں کے اندر پیدا ہو کر، مسلمانوں کی ملت میں آنکھیں کھول کر، مسلمان معاشرے کا ایک جزو ہو کر، اِس قوم کے دین اور اس کے نظامِ حیات ہی سے اپنے مقدس ترین تعلقات اور روابط کو اس طرح کاٹ سکتا ہے، وہ کل اِس قوم کے ساتھ کوئی غداری اور خیانت نہ کر بیٹھے گا۔ ظاہر

بات ہے کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی بندگی ہی میں تو یہ طرزِ عمل اختیار کر رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب اس کی خواہشات اس سے یہ کچھ کرا سکتی ہیں تو کل یہی خواہشات اس سے اور کیا کچھ نہ کرا سکیں گی؟

حضرات، ہمیں بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے کہ یہ صورتِ حال ہمارے ہاں آخر کیوں پیدا ہوئی ہے۔ اگر چند آدمی ہی اس میں مبتلا ہوتے تو اسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا، مگر یہاں تو ہزاروں لاکھوں آدمی ہمارے اندر ایسے موجود ہیں جو علانیہ اور فخریہ رمضان میں کھاتے پیتے رہتے ہیں اور اُلٹا روزہ داروں کو شرمندہ کرتے ہیں۔ یہ فی الواقع بڑی تشویش کی بات ہے۔ اور ہمیں اس کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ صورتِ حال دراصل اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ہم نے ایک مدت سے اس بات کی پروا کرنی چھوڑ دی ہے کہ ہمارے اندر جو اصلاحِ عظیم اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب نے کی تھی وہ ہمارے معاشرے میں باقی رہتی ہے یا ضائع ہو جاتی ہے۔ ہمیں اپنی قوم کی دنیا بنانے کی تو بڑی فکر رہی ہے اور اس کے لیے ہم بڑی تگ و دو کرتے رہے ہیں، مگر اُس عظیم الشان اخلاقی و روحانی اصلاح اور اُس زبردست دینی نظام کو برقرار رکھنے کی کوئی فکر ہمیں نہیں رہی جس پر ہماری ملت کے معاشرے کو قائم کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس ہمارے ہاں بڑے پیمانے پر تعلیم و تربیت اور قانون و ضابطہ کا وہ نظام کارفرما رہا ہے جو اس ڈھانچے کو منہدم کرنے والا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے عظیم ترین مقدسات کے پامال ہونے کی ہمارے با اثر طبقے اتنی پروا بھی نہیں کرتے جتنی اپنی پتلون کی شکن خراب ہو جانے کی کرتے ہیں۔

حضرات، انسان کی اصلاح ایک بڑا مشکل کام ہے، اس کو بگاڑنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اصلاح کرنی ہو تو سالہا سال کی محنتوں اور مسلسل کوششوں سے ہوتی ہے۔ بگاڑنا ہو تو اس کے لیے کوئی خاص محنت و کوشش درکار نہیں ہوتی، بسا اوقات صرف سعی اصلاح سے غفلت ہی اس کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ آپ ایک بچے ہی کی مثال لے لیجیے۔ اس کو آپ ایک اچھا اور پاکیزہ انسان بنانا چاہیں تو آپ کو برسوں اپنی جان کھپانی پڑے گی تب کہیں اس کے ذہن اور عادات اور خصائل کو آپ سنوار سکیں گے۔ لیکن اگر آپ یہ چاہیں کہ وہ بگڑے تو اس کے لیے کسی خاص کوشش کی حاجت نہیں ہے۔ صرف باگیں ڈھیلی چھوڑ دینا کافی ہے، معاشرے میں ہر طرح کے لچوں لفنگوں کے ساتھ چل پھر کر وہ خود بگڑ جائے گا۔

محنت اور کوشش کی ضرورت ترقی کے لیے ہوتی ہے نہ کہ تنزل کے لیے۔ آپ کسی گاڑی کو بلندی پر لے جانا چاہیں تو بڑی طاقت صرف کیے بغیر وہ اوپر نہ چڑھ سکے گی۔ نشیب کی طرف جانا چاہیں تو صرف بریک ڈھیلا چھوڑ دیجیے۔ گاڑی خود لڑھکے گی اور جہاں تک نشیب ملے گا لڑھکتی چلی جائے گی۔ ایسا ہی معاملہ انسانی معاشرے کا ہے۔ کسی معاشرے کو درست کر کے ایک اعلیٰ درجے کے نظامِ فکر و عمل کا پابند بنانا بڑا محنت طلب کام ہے جس کے لیے صدیوں کی کوششیں درکار ہوتی ہیں۔ مگر ان کوششوں کے ثمرات و نتائج کو ضائع کرنے کے لیے صرف اتنی بات بھی کافی ہو سکتی ہے کہ آپ ان کو قائم و برقرار رکھنے کی فکر چھوڑ دیں اور جو بگاڑ بھی معاشرے میں پھیلتا نظر آئے اس کی پروا نہ کریں۔ مسلمانوں میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں وہ کچھ یونہی اتفاقاً نہیں پیدا ہو گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اور ان کے بعد امت کے صلحاء و اتقیاء اور علماء و فقہاء نے صدیوں کی عرق ریزی و جانفشانی سے کروڑوں انسانوں کو کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکالا۔ اخلاق کی پستیوں سے اٹھایا۔ جاہلیت کی رسموں اور طور طریقوں کو مٹایا۔ خدائے واحد کی بندگی کے لیے ان کو تیار کیا۔ آخرت کی بازپُرس کا عقیدہ ان کے دلوں میں بٹھایا۔ اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم و تربیت دے کر ایک خاص کیرکٹر ان کے اندر پیدا کیا۔ نماز اور روزے اور حج اور زکوٰۃ جیسی پاکیزہ عبادات ان میں رائج کیں۔ اور اسلامی نظامِ تہذیب و تمدن کا ایک مضبوط سانچا تیار کر دیا جس کی بدولت مسلمان اُن خوبیوں سے آراستہ ہوتے جو دوسروں کے لیے قابلِ رشک تھیں۔ یہ جو کچھ صدہا برس کی محنتوں اور مسلسل کوششوں سے بنا ہے اس کو ہم ضائع اور برباد کرنا چاہیں تو آسانی سے کر سکتے ہیں۔ لیکن اسے پھر تعمیر کرنا چاہیں تو پھر صدیاں ہی اس کے لیے درکار ہوں گی۔

یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہمارے اسلاف نے سینکڑوں برس کی محنتوں سے ہمارے اندر جو اصلاح کی تھی اس کو ہم نے پچھلے ایک صدی کے اندر بُری طرح ضائع کیا ہے۔ پہلے انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں وہ بہت کچھ ضائع ہوئی۔ اور اب اُن کی غلامی ختم ہو جانے کے بعد خود اپنے حکمرانوں کے دور میں ہم اس کو پہلے سے بھی زیادہ ضائع کر رہے ہیں۔ یہ وہی غلطی ہے جس پر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر متنبہ فرمایا گیا ہے کہ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا " زمین میں اصلاح ہو جانے کے بعد اُس میں بگاڑ پیدا نہ کرو"۔

رُوئے زمین پر بسنے والے انسانوں کی زندگی میں جتنی بھی اصلاح ہوئی ہے انبیاء علیہم السّلام اور نوعِ انسانی کے نیک انسانوں کی ہزار ہا برس کی کوششوں سے ہوئی ہے۔ ایک ایک بُرائی کا سدباب کرنے اور ایک ایک بھلائی کو قائم کرنے میں خدا کے صالح بندوں کو صدہا برس محنت کرنی پڑی ہے تب جا کر دنیا میں کچھ عالمگیر اخلاقی ضوابط پر انسانی تہذیب کی تعمیر ہو سکی ہے۔ اس تعمیر کو برباد تو آسانی سے کیا جا سکتا ہے، مگر پھر سے اس کو تعمیر کر دینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ایک معمولی مثال دیکھیے۔ صرف یہ بات کہ عورت اور مرد کا تعلق نکاح کے سوا کسی اور صورت میں نہ ہو، انسان کو اس کا قائل کرنا اور اس کا خوگر بنانا اور معاشرے میں اس کو ایک مسلّم ضابطے کی حیثیت سے رائج کر دینا اتنا مشکل کام تھا کہ انبیاء علیہم السلام اور صالحینِ نوعِ انسانی کو اس کے لیے ہزار ہا برس تک کوشش کرنی پڑی ہوگی تب کہیں دنیا میں یہ ایک اصلاح نافذ کی جا سکی ہوگی۔ اس لیے کہ انسان میں جنسی انارکی کی طرف ایسا زبردست میلان موجود ہے کہ اسے ایک اخلاقی ضابطہ کا پابند بنا دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اِس اصلاح کو ضائع کر دینے کے لیے کسی بڑی محنت کی ضرورت نہیں۔ عورتوں اور مردوں میں آزادانہ اختلاط کی راہیں کھول دیجیے اور خاندانی منصوبہ بندی کے ذرائع و وسائل عام لوگوں کی دست رس تک پہنچا دیجیے۔ جنسی انارکی کا دیو جسے مشکل سے باندھا گیا تھا ایک دفعہ کھل جانے کے بعد دیکھتے دیکھتے اُس ساری اصلاح کو غارت کر دیگا جو ہزار ہا برس کی کوششوں سے ہوئی تھی لیکن اس کے تباہ کن نتائج سامنے آنے کے بعد جس طرح کہ آج وہ مغربی معاشرے کے سامنے انتہائی بھیانک صورت میں آرہے ہیں، آپ اگر چاہیں کہ پھر اس دیو کو قید کر دیں، تو یہ کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ اس کے لیے پھر صدہا برس ہی کی محنتیں درکار ہونگی۔ اسی لیے قرآن مجید انسانیت کے غارت گروں کو متنبہ کرتا ہے کہ زمین میں جو اصلاح بڑی مشکلوں سے ہوئی ہے اس کو تم اپنی حماقتوں سے برباد نہ کرو۔

اسی ایک مثال پر آپ قیاس کر لیجیے کہ جس عظیم الشان عمارت کا نام اسلامی تہذیب و تمدن ہے اس کی تعمیر کس مشکل سے ہوئی ہوگی۔ کتنی جہالتوں اور گمراہیوں کو مٹا کر اور کتنی بُرائیوں کا سدباب کر کے اس کے لیے زمین صاف کی گئی ہوگی۔ کتنی جانفشانیوں سے صحیح عقائد اور صحیح خیالات ذہنوں میں بٹھائے گئے ہونگے۔ کیا کچھ محنتیں اخلاقی حدود اور ضوابط کو معاشرے میں عملاً قائم کرنے پر صرف کی گئی ہونگی۔ اور

پھر اس پوری عمارت کو سہارنے کے لیے اسلامی نظامِ زندگی کے یہ پانچ ستون ــــ شہادت، توحید، نماز، روزہ اور حج ــــ مضبوطی کے ساتھ جمائے گئے ہونگے۔ یہ جو کچھ بنا ہے ہمارے اسلاف کی بے حد و حساب کوششوں سے بنا ہے، اور یہ عظیم سرمایہ ہمیں میراث میں مفت مل گیا ہے۔ اس کو اگر ہم ترقی نہیں دے سکتے تو کم از کم اسے برباد تو نہ کرنا چاہیے۔ ہمارا نظامِ تعلیم و تربیت، ہمارا لٹریچر، ہمارا تصورِ ثقافت، اور بحیثیت مجموعی ہمارے قوانین اور نظم و نسق اور معیشت و معاشرت کا پورا نظام جس رفتار سے اس سرمائے کی ناقدری کرنے والے اور اس کو برباد کرنے والے لوگ روز بروز زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا کر رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید نہیں کہ ایک روز ہم اس کو بالکل کھو دیں گے۔ اور اگر ایک دفعہ ہم نے اسے کھو دیا تو پھر اسے از سرِ نو حاصل کر لینا کوئی آسان کام نہ ہو گا۔ خدا نہ کرے کہ وہ وقت آئے، اور خدا کرے کہ اس کے آنے سے پہلے ہی ہم سنبھل جائیں۔

توضیح مزید:۔ اِس تقریر کے ابتدائی حصہ میں رویتِ ہلال کے مسئلے پر جو بحث کی گئی ہے اُس کے سلسلے میں دو امور اور بھی ایسے ہیں جنہیں نگاہ میں رہنا چاہیے۔

۱۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۶ء تک ۱۲ سال کے دوران میں پورے ۹ سال ایسے گزرے ہیں جن میں سابق صوبہ سرحد کے اکثر و بیشتر مقامات کی عید پاکستان کے باقی تمام حصّوں سے ایک یا دو دن پہلے ہوئی ہے۔ صرف تین سال (۱۹۵۶ء، ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۳ء) ایسے تھے جن میں پورے ملک کی عید ایک دن ہوئی اور یہ سال وہ تھے جن میں سب جگہ ۲۹ کا چاند دیکھ لیا گیا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس پر اخبارات کے فائل گواہ ہیں۔ اب ۱۹۶۶ء میں پہلی مرتبہ رویتِ ہلال کے معاملہ میں سابق صوبۂ سرحد کی اطلاعات کو پورے ملک کے لیے حجت قرار دینے پر اصرار کیا گیا ہے، حالانکہ یہ امر ابھی تحقیق طلب ہے کہ وہاں باقی ملک سے پہلے چاند نظر آنے کی کیا خاص وجہ ہے۔

۲۔ ۲۴ جنوری کی شام کو لاہور میں جو چاند دیکھا گیا وہ یقیناً بدر کامل نہ تھا، حالانکہ اگر ۱۲ جنوری کو شوال کی پہلی تاریخ ہوتی تو یہ چودھویں کا چاند ہونا چاہیے تھا لیکن وہ مکمل بھی نہ تھا اور اتنی بلندی

پر تھا جس پر چودھویں کا چاند کبھی نہیں ہوتا۔ بدر کامل کا ظہور یہاں ۲۵ر جنوری کو ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ شوال کی پہلی تاریخ ۱۳ر جنوری کو تھی نہ کہ ۱۲ر کو۔ اگر سابق صوبۂ سرحد میں چاند کی یہ کیفیت نہیں پائی گئی ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہاں کا مطلع پاکستان کے دوسرے حصوں سے مختلف ہے۔

(بقیہ اشارات)

تو اس سے انسان کے پاکیزہ احساسات اور مقدس جذبات کو پرورش پانے کا موقع ملتا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر ناصر صاحب نے بڑی صراحت کے ساتھ ایوان کو بتایا کہ قومی اتحاد و اتفاق کے لیے اس قسم کے احمقانہ اور بے ربط فلسفے کسی پہلو سے بھی مفید اور کارآمد نہیں ہوتے۔ ان سے سوائے فکری اور عملی انتشار کے اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اتحاد و اتفاق بلاشبہ قوم کی ترقی کے لیے ضروری ہے لیکن یہ آج تک بجائے خود کسی قوم کا مطلوب و مقصود نہیں بن سکا۔ اس کا مظاہرہ قوموں نے کسی بلند و بالا مقصد کے حصول کے لیے کیا ہے۔ جب ایک قوم کسی نظریۂ حیات کو دل و جان سے اپنا لیتی ہے تو بالکل فطری طور پر اس کے اندر اتفاق و اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بڑی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ ایوان کے سامنے اربابِ اختیار کی موجودگی میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ یہ بتایا کہ انڈونیشی قوم اگر دنیا میں عزت و آبرو کا کوئی مقام حاصل کر سکتی ہے تو وہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو نظریہ اس قوم کا جوہرِ حیات ہے اور جس کی روایات اس کی زندگی کی گہرائیوں میں اتر چکی ہیں اور جو انسان کی دنیوی فلاح اور اخروی کامرانی کی ضمانت ہے، اُسے اس ملک کی تشکیلِ نو میں پورے شعور اور عزم کے ساتھ بطورِ اساس قبول کر لیا جائے مگر یُوں محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص کی ساری مخلصانہ باتوں کو مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا سکارنو صاحب پنج شیلا کے فلسفے کو سامنے رکھ کر سرگرمِ عمل رہے۔

اکبر کے دینِ الٰہی کی طرح سوکارنو صاحب کے اختراعی فلسفے یا پنج شیلا میں بھی بنیادی خامی یہ تھی کہ اس قسم کے بے ربط نظریات کے یہ ملغوبے بڑے بے جان ہوتے ہیں اور یہ کبھی بھی کسی فرد یا قوم کے لیے فکر و عمل کے محرکات فراہم نہیں کر سکتے۔ ان سے نہ تو زندگی میں فکری ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور نہ

عمل کی حرکت اور حرارت۔ بلکہ یہ انسان کے قلب و دماغ میں ایک نظریاتی خلا پیدا کر دیتے ہیں جسے وہ دوسرے نظریات سے پُورا کرتا ہے۔

یہی صورت حال انڈونیشیا میں پیش آئی۔ اتفاق و اتحاد کی غرض سے قوم کو اسلام جیسی نعمتِ عظمیٰ سے محروم رکھا گیا اور اُسے پنچ شیلا جیسے بے جوڑ فلسفے کو اپنانے کی تلقین کی گئی۔ مگر چونکہ اس بے جان اور بے ربط نظریے سے انسان کو نہ ذہنی سکون اور اطمینان میسّر آتا تھا اور نہ اُس کی عملی زندگی میں کوئی حرکت پیدا ہو سکتی تھی اس لیے "جائے خالی را دیومی گیرد" کے مصداق آہستہ آہستہ اشتراکیت کی جڑیں پھیلنی شروع ہو گئیں۔

دوسری طرف سکارنو کی جو طبعی افتاد تھی اسے اسلام تو کسی صورت بھی گوارا نہ تھا۔ یہ شخص زبان کے استعمال میں بڑا مطلق العنان ہے اور عمل کی کمی کو کھوکھلے نعروں سے پُر کرنے کی بڑی صلاحیت رکھتا ہے پھر صنفِ نازک کے معاملے میں بھی یہ اپنے جذبات پر قطعاً قابو نہیں رکھ سکتا۔ عورت اس کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ ان کمزوریوں کی موجودگی میں سکارنو دنیا کی ہر چیز برداشت کر سکتا تھا مگر اسلام کے بندھن اُس کے لیے کسی طرح بھی گوارا نہ تھے۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء میں اُس نے کمیونسٹ جماعت کی باقاعدہ حمایت شروع کر دی۔ یہ پارٹی چونکہ ایک بڑی فعّال اور سرگرم جماعت تھی اس لیے سکارنو نے یہ سمجھا کہ اس کی تائید کر کے وہ اس کی قوتِ عمل سے بھرپور فائدہ اٹھائے گا۔ لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی حماقت کی وجہ سے جلد ہی اس کے ہاتھوں میں مغلوب ہو کر رہ جائے گا۔

کمیونسٹ پارٹی نے سکارنو کو شیشے میں اتارنے کے لیے سب سے پہلے اُس کی جس کمزوری سے فائدہ اٹھایا وہ شہرت اور ناموری کا بے پناہ جذبہ تھا۔ چنانچہ کمیونسٹ پریس نے اُس کی تعریف و توصیف میں بالکل بے سروپا باتیں لکھنا شروع کر دیں۔ اُسے انقلاب کا عظیم رہنما، انڈونیشیا کا واحد نجات دہندہ اور کسانِ عظیم کے معزز خطابات سے نوازا۔ اُسے اپنی شعلہ بیانیاں دکھانے کے لیے مجمع فراہم کیے

تاکہ وہ اپنی زبان کے جوہر کھل کر دکھا سکے۔ اُس کی ان جذباتی تقریروں کو شہ سرخیوں کے ساتھ اخبارات میں شائع کیا جاتا اور اُن کی مدح میں بڑے بڑے طویل اداریئے لکھے جاتے۔ سکارنو اپنی ذات کے ان طلسمات میں گرفتار ہو کر عجیب و غریب حرکات کرنے لگا۔ اس کا زیادہ وقت یا تو حسینوں کے جھرمٹ میں گزرنے لگا، یا کمیونسٹ پارٹی کی تعریف اور اس کے مقابلے میں دوسری پارٹیوں پر طنز و تعریض میں، یا پھر زبان کے کمالات دکھانے میں۔ کمیونسٹوں نے اس کو یہاں تک شیشے میں اتار لیا کہ اس نے ڈاکٹر ناصر کو نظر بند اور ماشومی پارٹی کو ممنوع قرار دے کر ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ کو دور کر دیا اور اس کے بعد کمیونسٹ پارٹی سیلاب کی طرح پھیلنی شروع ہو گئی۔

اس خود پسند انسان کو اگر دنیا میں اب کسی چیز سے محبت رہ گئی تھی تو وہ صرف اپنی ذات اور اپنا اقتدار تھا۔ چنانچہ پنج شیلا کی جگہ اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ موجودہ حالات میں تین طاقتیں اس ملک کو متوازن خطوط پر چلا سکتی ہیں نیشنلزم، اسلام اور کمیونزم۔ ان کے مجموعہ کے لیے اس نے ناساکوم کی اصطلاح گھڑی۔ اس نوعیت کی بے سروپا باتیں وہ بڑے فخر سے کرنے لگا۔ قوم پرستی، اسلام اور اشتراکیت تینوں ایسے نظام ہائے حیات ہیں جن کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔ نیشنلزم اپنی قوم کے فطری تفوق اور دوسری اقوام کے خلاف جذبۂ نفرت و حقارت پر مبنی ہے اس لیے اسلام سے اس کا کسی طرح جوڑ نہیں ہو سکتا۔ پھر جو نظریہ ملکی مفادات کو خیر و شر کا معیار قرار دیتا ہو وہ اسلام کے ضابطۂ حیات کو کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام اپنے اساسی تصورات سے لے کر حیاتِ انسانی کی معمولی سے معمولی جزئیات تک اشتراکیت سے الگ اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے لیکن سکارنو صاحب ان تینوں متناقض اور متضاد نظامہائے حیات پر اپنی قومی زندگی کی تشکیل کرنے پر مصر تھے۔ ان کا یہ بے جا اصرار ایک تو ان کے ذہنی افلاس اور دوسرے اُن کے مزاج اور اُن کے اپنے مخصوص مفادات کی وجہ سے تھا۔ قوم پرستی کا ڈھونگ رچا کر وہ اپنی قوم کے جذبات کو دوسری اقوام کے خلاف مشتعل کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ غیظ و غضب میں خود اپنے قائد محترم کی کارگذاریوں پر غور نہ کرے اور

انہیں اُن کی ساری بداعمالیوں کے باوجود اپنا نجات دہندہ ہی سمجھتی رہے۔ اشتراکیت کا دم بھر کر وہ کمیونسٹ پارٹی کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور اپنی اخلاقی کمزوریوں کے لیے سندِ جواز حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور اسلام کا نام وہ اپنے عوام کے مذہبی جذبات سے کھیلنے اور انہیں بے وقوف بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

سکارنو اس امر کا برابر التزام کرتا رہتا کہ کسی طرح اس کی قوم کا اشتعال ٹھنڈا نہ ہونے پائے۔ اس لیے وہ کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر ایسے حالات پیدا کرتا رہتا جس سے عوام ایک قسم کے ذہنی بخار میں مبتلا رہیں۔ اسی مقصد کے تحت اس نے ملائشیا پر دھاوا بول دیا اور اُس کے خلاف یہاں تک جذبۂ نفرت و حقارت پیدا کیا کہ جنوری ۱۹۶۴ء میں جب اسے سیکورٹی کونسل میں نشست ملی تو سوکارنو نے کمیونسٹ پارٹی کے سربراہوں ایدیت اور سوباندریو کے مشورے سے اقوامِ متحدہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ ایک تو سکارنو کے اپنے مزاج نے، دوسرے اُس کے غلط کار مشیروں نے ایسے حالات پیدا کیے جس میں حکمت و دانائی کی بات کرنے والوں کے لیے کوئی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ اگر یہ شخص کبھی غور و فکر پر آمادہ ہوتا بھی تو کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر فوراً اُسے بہکا کر اپنی مجنونانہ روش اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے۔ چنانچہ دیکھیے کہ ملائشیا کے بارے ہی میں ملک کے اہل الرائے کا یہ احساس تھا کہ دونوں ممالک کے اختلافات اتنے گہرے اور شدید نہیں ہیں کہ فوجی کارروائی کے بغیر ان کا حل نہ ہو سکتا ہو۔ لیکن کمیونسٹ فوجی اقدام پر بضد تھے اور سکارنو جب کبھی اپنی پالیسی میں تبدیلی کا خیال کرتا تو وہ فوراً اس راہ میں حائل ہو جاتے۔ موسم سرما کی ایک شام سوکارنو اپنے محل میں خوبصورت لڑکیوں کے رقص سے دِل بہلا رہا تھا کہ ایدیت نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"تم ملک کی جس لڑکی سے چاہو اُسے اپنے مصرف میں لے آؤ لیکن ملائشیا کو کچلنا نہ بھولنا۔"

سکارنو اگرچہ ایک غلط راستے پر چل نکلا تھا مگر ملک کے سنجیدہ طبقے برابر اس کوشش میں مصروف تھے کہ کسی طرح حالات سنبھل جائیں۔ ملک کے اندر اشتراکی لٹریچر دھڑا دھڑ چھپ رہا تھا۔ کمیونسٹ اقتدار کی شہ پا کر عوام کے مذہبی جذبات کو کچوکے لگا لگا کر انہیں مُردہ کرنے میں منہمک تھے۔ مساجد کی بے حرمتی اور قرآن مجید کی علانیہ توہین ان کا معمول بن گیا تھا۔ ثقافت اور ادب کے نام پر لوگوں کے اندر مذہبی بیزاری پیدا کرنے کی بھرپور کوششیں ہو رہی تھیں۔ کلبوں کے اندر رقص و سرود کی محفلوں کے ذریعے نوجوانوں کے اخلاق کو برباد کیا جا رہا تھا۔ کمیونسٹ اس حقیقت کو خوب جانتے ہیں کہ اگر کسی قوم کے اخلاق کا دیوالہ پٹ جائے تو وہ پھر کسی مذہب کی علمبردار بن کر دنیا میں کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔ مذہب اور اخلاق دونوں لازم ملزوم ہیں۔ جو قوم دنیا میں آبرو باختہ ہو جاتی ہے مذہب سے اس کا خود بخود رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور وہ انحطاط کی شکار ہو جاتی ہے اور پھر اپنی زندگی کے لیے کسی باطل فلسفۂ حیات کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انڈونیشیا میں یہی ہوا۔ نوجوانوں پر جونہی اخلاق کی گرفت ڈھیلی ہوئی وہ موج در موج اشتراکیت کی صفوں میں جا گھسے اور اس کے مبلغ اور علمبردار بن گئے۔

مذہبی طبقوں پر جس طرح عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا تھا اور اُن پر جس بے بسی اور بے کسی کا عالم طاری تھا اُس کا اندازہ مندرجۂ ذیل دو تقریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک تقریر ایک عیسائی پادری اور دوسری ماشومی پارٹی کے ایک لیڈر کی ہے۔ پادری صاحب کہتے ہیں:

> "کمیونسٹوں نے اشتراکیت کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے بائیبل اور قرآن کی تشریح و توضیح ایسے انداز پر کی ہے جس سے یہ دونوں کتب سماوی اشتراکیت کے منشور نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے ملک بھر میں کتب اور رسائل کی اشاعت اور تقاریر و اعلانات کا وسیع انتظام کیا ہے۔ اس وقت ہمیں ان لپٹے نعروں کا سامنا ہے جو بدل بدل کر عوام کو فریب دینے کے لیے لگائے جا رہے ہیں۔ یہ اشتراکی ہمیں استعمار کے ایجنٹ اور تخریب پسند ہونے کے طعنے دیتے ہیں۔ اس وقت ان سے یہ مطالبہ کرنا کہ آؤ ہمارے ان الفاظ

کو سنو جن میں ہم عدل و انصاف کے قیام کی اور ظلم اور شر و فساد کے قلع قمع کی دعوت دیتے ہیں، عبث اور بیکار ہے۔ اس قسم کی دعوت دینے والوں کی بات سنے بغیر ہی ان کو استعمار کا ایجنٹ کہا جاتا ہے ___!

یہ بات صحیح ہے کہ اب مسجد و گرجا میں سے بلند ہونے والی ہر آواز خطرناک ہے کیونکہ فوج اس کی مخالف اور اقتدار اس کا دشمن بن چکا ہے۔ مگر دین اور مذہب کی یہ مخالفت محض عارضی ہے۔ انسانی رُوح جب بھی بیدار ہوگی تو وہ مذہب ہی سے اطمینان اور سکون حاصل کرے گی۔ اگر بالفرض وہ بیدار نہ بھی ہو تو خدا کا کلمہ تو بہر حال آفاق میں پھیل کر رہیگا۔ انسان جب بھی ناکام اشتراکی انقلابوں اور مختلف دسترے بندلویں سے مایوس اور نامراد ہوگا تو وہ مذہب کی آغوش ہی میں پناہ لے گا"

ماشومی پارٹی کے لیڈر نے کہا:

"محترم! آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ سو فیصد صحیح اور درست ہے، لیکن آپ نے ہمیں اشتراکیت کے خلاف سرگرم عمل اور ہر محاذ پر اُس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی دعوت نہیں دی۔ ہمیں مسجد و کلیسا کو صرف روحانی پناہ گاہ بنانے پر اکتفا نہ کرنا چاہیے بلکہ انہیں قومی تحریک کا مرکز بنانا چاہیے۔ اشتراکیت ایک نظامِ حیات ہے۔ اس کے کام کرنے کی اپنی ایک مخصوص تکنیک ہے اور اُس نے دینی محاذ کو کافی کمزور کر دیا ہے۔ لیکن ہم ماشومی پارٹی سے تعلق رکھنے والوں نے قہر سلطانی اور سیاسی مخالفت کے باوجود حالات کے مقابلے کا عزم کر رکھا ہے۔ اسی عزم کے تحت ہم سیاسی اور تعلیمی میدانوں میں بڑے خلوص کے ساتھ کام کریں گے۔ کیونکہ ان پر حکومت کو اجارہ داری حاصل نہیں ہے۔ ہم مزدوروں نوجوں اور طلبا میں اپنے ہی خواہ اور حامی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم اس اضطراب کو ختم کرنے اور اُس ذہنی انتشار کو مٹانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں جسے بدقسمتی سے اشتراکیت نے جنم دیا ہے۔ ہم لوگوں پر یہ حقیقت واضح کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اشتراکیت

صرف الحاد و زندقہ کا قصۂ پارینہ نہیں بلکہ جدید استعماریت ہے۔ یہ ایک عیارانہ چال ہے جس میں سادہ لوح فوراً گرفتار ہو جاتے ہیں۔ یہ نظام ذہنوں کے اندر کبریائی، شخصی تفاخر، انانیت اور اکھاڑ پچھاڑ کے احساسات پیدا کرتا ہے۔ بائیں بازو کے انقلابیوں نے ایک ایسے خطرناک گروہ کو تیار کیا ہے جو عبادت گاہوں کے لیے کوئی احترام نہیں رکھتا۔ وہ شفقت اور محبت کے لطیف احساسات سے یکسر عاری ہے۔ وہ اپنی مقصد براری کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ بلا تکلف استعمال کرتا ہے۔ اس کے پروگراموں میں کوئی معقولیت نہیں ہوتی۔ موجودہ فکری انتشار اور پُرآشوب حالات، جن میں اس وقت عوام اور ملک گرفتار ہیں، یہ سب کچھ سوکارنو صاحب کی غلط پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ ان کی ذمہ داری کسی دوسرے پر قطعاً عائد نہیں ہوتی ہم اصحاب اقتدار کو قومی اور ملی ورثے کے تحفظ کی دعوت دیتے ہیں۔ ہمیں صدر کے آمرانہ طرز عمل، نوکر شاہی کے تسلط اور اشتراکیوں کی چیرہ دستیوں سے شدید نفرت ہے۔"

(روزنامہ الحیاۃ۔ بیروت ۲۳ جولائی ۱۹۶۶ء)

یہ ہے اُس ذہنی انتشار اور فکری آویزش کی تصویر جو سکارنو کی اشتراکیت نواز پالیسی کی وجہ سے ملک میں پیدا ہوئی۔ مگر اُسے اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ اُسے تو محض اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جمانے مقصود تھے۔ چنانچہ اُس نے ہر اُس شخص کو جیل میں ڈال دیا جس نے اُس کے طرزِ عمل پر تنقید کرنے کی جسارت کی اور مقرروں اور خطیبوں کو بتایا کہ جب بھی زبان کھلے تو صرف اس نجات دہندہ کی حمایت میں کھلے ورنہ بند رہے۔ قلم اگر اُٹھیں تو سرکار عالی مدار کی مدح و توصیف میں ورنہ انہیں توڑ دیا جائے۔ جب سکارنو صاحب نے یہ محسوس کیا کہ عوامی اضطراب کی لہریں برابر بڑھتی جا رہی ہیں اور ساری پیش بندیوں اور پابندیوں کے باوجود کچھ لوگ اُن کے کانوں تک ناخوشگوار باتیں پہنچا کر ان کے عیش کو برباد کرتے رہتے ہیں تو انہوں نے بیک جنبش قلم ۵ جولائی ۱۹۵۹ء کو ایک صدارتی فرمان کے ذریعے ملک کے نمائندہ قانون ساز اداروں کو توڑ دیا اور مختلف مشاورتی کمیٹیوں کی تشکیل کر کے ایک نئے انقلاب کا نعرہ لگایا جسے وہ GUIDED DEMOCRACY ہدایت یاب

جمہوریت'' کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ اس جمہوریت کی حیثیت محض ایک ڈھونگ کی سی تھی جس کے پیچھے صرف ایک ہی جذبہ کارفرما تھا، یہ کہ سوکارنو ملک کے سارے سیاہ وسپید کا مالک بن جائے اور کسی شخص کو اُس کے کسی قول اور فعل کے بارے میں بازپُرس کرنے کا حق باقی نہ ہو۔ اس نئی جمہوریت نے ملک کے سارے اختیارات اور اس کے سارے وسائل بلاشرکت غیرے اس ایک فرد کے سپرد کردیئے۔ اس کے ساتھ ہی نشرواشاعت کی پُوری مشینری حرکت میں آئی اور اُس نے عوام کے ذہنوں میں اس باطل خیال کی آبیاری کرنا شروع کی کہ ملک کی فلاح وبہبود کا راز اسی میں مضمر ہے کہ ملکی مسائل کے حل کے لیے صرف ''باپو'' پر انحصار کیا جائے اور وہ جو کہے اور جو کرے اس کو مشیتِ ایزدی سمجھ کر بلاچون وچرا قبول کرلیا جائے۔ جن لوگوں نے سکارنو کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا انہیں میدان سے ہٹا دیا گیا۔ اس جرم کی سزا پانے والوں میں تحریکِ آزادی کی ایک نہایت قابلِ احترام شخصیت ڈاکٹر محمد حتیٰ بھی تھے جو ملک میں سوکارنو کے بعد دوسرے درجے پر سمجھے جاتے تھے۔

ملک کی ساری قوت وطاقت باپو کے ہاتھ میں پوری طرح منتقل ہوچکی تھی اور باپو کو اشتراکیت کے فرزندانِ ارجمند اچھی طرح شیشے میں اُتار چکے تھے، اس لیے باپو نے بڑے دھڑتے سے ہر قسم کے خوف سے بے نیاز ہوکر من مانی کارروائیاں شروع کردیں۔ ہم پہلے بھی عرض کرچکے ہیں کہ یہ شخص خودپسندی کے نفسیاتی مرض میں بہت بُری طرح مبتلا تھا اور کمیونسٹ اُس کی اس کمزوری کو بھانپ کر اس سے بے پناہ فائدہ اٹھا رہے تھے۔ چنانچہ باپو نے اپنی ذات کے گرد شہرت اور ناموری کا ہالہ بنانے کے لیے ایسے ایسے کام شروع کیے جن سے ہر روز اخبارات اور پریس میں اُس کے متعلق بڑی حیرت انگیز اور دلنواز خبریں شائع ہوسکیں۔ زرمبادلہ اور غیرملکی امداد کو اگر معدنی اور زرعی پیداوار مثلاً ربڑ، تیل، لوہے، تانبے اور کانی کی ترقی میں صرف کیا جاتا تو یہ کام ایک لمبے منصوبے کے تحت سرانجام پاتا اور اس سے اخبارات کے لیے دفعتاً کوئی بہت خوش کُن خبر نہ بن سکتی تھی۔ اس لیے قومی دولت غیرپیداآور مگر ہنگامہ خیز کاموں پر بے دریغ صرف کی جانے لگی۔ ان کاموں میں سرِفہرست بلند وبالا عمارات کی تعمیر ہے۔ چنانچہ گینفو سپورٹس کلب کی تعمیر پر کم وبیش

دس کروڑ ڈالر پانی کی طرح بہا دیئے گئے۔اس کے ساتھ ہی ایک لاکھ نشستوں پر مشتمل بنگ کارنو اسٹیڈیم تعمیر ہوا۔جکارتہ کے ایک بڑے اور تمام سامان تعیش سے بھرپور ہوٹل پر دس کروڑ بیس لاکھ ڈالر صرف ہوئے۔اسی طرح ۳۰ کروڑ ڈالر کے خرچ سے ایک مسجد اور ۳ لاکھ ڈالر سے ایک ۴۳۰ فٹ اونچا مخروطی شکل کا قومی عجائب گھر تعمیر ہوا۔ان عمارات کے علاوہ بے شمار عمارتیں ابھی ایسی بھی ہیں جن کی تکمیل نہیں ہو سکی۔ان میں دنیا کا سب سے بڑا ڈیپارٹمنٹ اسٹور، ایک وسیع و عریض پریس ہاؤس (جہاں سوکارنو کی طرف سے بلائی جانے والی افرایشیائی کانفرنس کے نمائندوں کو مفت ٹھہرانے کا انتظام کیا جا رہا تھا) اور طویل و عریض عمارتوں کی وہ قطاریں قابلِ ذکر ہیں جن میں ایر جنسی فورس قیام کر سکتی تھی۔

قومی فضا میں تلاطم پیدا کرنے، عوام کو اپنی ذات کی طرف متوجہ رکھنے، انہیں اصل صورتِ حال پر غور و فکر کے مواقع سے محروم کرنے، اور نمائشی کاموں سے ان کا دل بہلانے کے لیے قومی بجٹ کا دو تہائی حصہ صرف ہو رہا تھا۔ان میں ایک طرف ملائیشیا کے خلاف بے مقصد مہم تھی اور دوسری طرف عظمت کی یادگاروں کی تعمیر۔غیر پیداآور کاموں پر اس طرح دولت لٹانے سے انڈونیشیا کی اقتصادی حالت بالکل تباہ ہو گئی۔سونے کے ذخائر ختم ہو گئے اور زرِ مبادلہ نہ ہونے کی وجہ سے کارخانے بند کرنے پڑے۔قرضوں کا بوجھ برق رفتاری کے ساتھ بڑھ رہا تھا اور ملک روس اور امریکہ کے ہاتھوں میں قریب قریب رہن رکھا جا چکا تھا۔قرضوں کی واپسی تو بڑی بات ہے عوام صرف سود کی ادائیگی کی بھی سکت نہ رکھتے تھے۔

جنگ اور عمارات کی تعمیر سکارنو کی شخصیت کو عارضی طور پر تابندہ بنانے کے لیے خواہ کتنی غیر معمولی اہمیت رکھتی تھیں لیکن اس سے عوام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔جنگ کے لیے دوسرے ممالک سے اسلحہ درآمد کرنا پڑا اور اس طرح ملکی دولت ان کے پاس چلی گئی۔اتنی بڑی عمارات کو غیر ملکی کمپنیوں کے تعاون اور نگرانی کے بغیر تعمیر کرنا ناممکن تھا۔اس لیے اس میدان میں بھی دولت اُن کی طرف منتقل ہونے لگی اور عوام بڑی تیزی کے ساتھ افلاس اور غربت کا شکار ہوئے۔جب ملک میں سرمایہ کاری

کی رفتار سست ہوئی تو بے روزگاری میں بھی اضافہ ہوا اور لوگوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹنے لگے لیکن باپو کو سوائے اپنی شاہ خرچیوں اور عیش پرستیوں کے اور کسی چیز سے سروکار نہ تھا۔ ملک کا ہر فرد بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ملک تباہ ہو رہا ہے مگر کمیونسٹوں اور کاسہ لیسوں اور خوشامدیوں کی فوج سکارنو کو برابر یہ یقین دلا رہی تھی کہ بربادی اور تباہی کے افسانے آپ کے دشمنوں نے آپ کے خلاف گھڑے ہیں اس لیے ان دشمنوں کی خبر لینی چاہیے۔ حضور کا اقبال تو بڑی تیزی کے ساتھ بلند ہو رہا ہے۔

ان کاسہ لیسوں کی فوج میں تاجروں اور صنعت کاروں کے نئے طبقے نے بھی اضافہ کیا۔ چونکہ ملکی تجارت و صنعت پر حکومت کا پورا کنٹرول تھا اس لیے جو لوگ حکومت کے ساتھ تعاون اور اس کی جا و بے جا حمایت کرنے پر آمادہ تھے انہیں دولت سے ہاتھ رنگنے کے بے پناہ مواقع میسر آنے لگے۔ لائسنسوں، پرمٹوں اور درآمدی اور برآمدی سہولتوں کی وجہ سے دیکھتے دیکھتے یہ لوگ لاکھوں اور کروڑوں کے مالک بن گئے۔ یہ حضرات حکومت کے بڑے مدح خواں تھے لیکن چونکہ اصل صورت بھی جانتے تھے اس لیے انہوں نے اندھا دھند کمائی ہوئی دولت کو سرمایہ کاری کے لیے وقف کرنے کے بجائے اپنی عیش پرستیوں پر صرف کرنا شروع کیا۔ اس سے ایک طرف تو ملک میں گرانی بڑھی اور دوسری طرف بیروزگاری میں تشویشناک حد تک اضافہ ہوا۔ اس صورتِ حال نے ملک کے اندر اخلاقی بے راہ روی کا طوفان اٹھا دیا اور ملک خود بخود اشتراکیت کی خطرناک راہ پر بڑھتا چلا گیا۔ اشتراکیت کے لیے ایسے حالات سے زیادہ سازگار حالات اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے کمیونسٹ خوب سوچ سمجھ کر ملک کو اس راہ پر ہانکے لیے جا رہے تھے۔

ان حالات میں سکارنو صاحب اوّل تو نصیحت کی کوئی بات سننے پر آمادہ ہی نہ تھے۔ اور اگر وہ آمادہ ہوتے بھی تو نصیحت اور خیر خواہی کی بات کرنے والوں کے بارے میں ان کے کاسہ لیس اور کمیونسٹ، دونوں ان کو یہ تاثر دیتے تھے کہ حضور! یہ خود غرض لوگ آپ کی شہرت اور ناموری کے حاسد ہیں اور آپ جیسے "عظیم باپ" کو تخت و تاج سے محروم کر کے خود ان پر قبضہ کرنا چاہتے

ہیں ۔اس لیے ان کی باتوں پر کان نہ دھرنا چاہیے ۔

جب کوئی قوم کسی حیات آفریں تصورِ حیات سے محروم ہو کر ذہنی خلا میں زندہ ہو، جب اُس میں اخلاقی بے راہ روی زور پکڑ رہی ہو، جب اُس میں رشوت ستانی اور اقربا نوازی کا دَور دورہ ہو، جب فاسد نظامِ معیشت کی وجہ سے ملک میں گرانی، افلاس اور بے روزگاری کا زور ہو اور عوام جسم اور رُوح کے رشتے کو قائم رکھنا بھی ایک عذاب سمجھ رہے ہوں، جب اُن کے اندر محرومی اور بے بسی کا احساس ہونے کی وجہ سے یاس و قنوطیت اور بد دلی پیدا ہو جائے اور وہ اپنے مصائب پر فریاد کرنے کا حق بھی نہ رکھتے ہوں اور حکمران طبقے کوئی صحیح اور تعمیری طرزِ عمل اختیار کرنے کے بجائے صرف اپنی تعریف و توصیف سننا پسند کریں، تو یہ حالات اشتراکیت کی توسیع و ترقی کے لیے روز بروز زیادہ سازگار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انڈونیشیا کی کمیونسٹ پارٹی کی قوت ان حالات میں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھنی شروع ہوئی اور چونکہ سوکارنو کی پوری حمایت و سرپرستی اس کو حاصل تھی، اس لیے وہ بے روک ٹوک پھیلتی چلی گئی۔ ۱۹۶۵ء میں اس پارٹی کے ارکان کی تعداد ساڑھے تیس لاکھ تک پہنچ گئی اور دو کروڑ سے اُوپر ہمدردان کے علاوہ تھے۔ سُرخ بلاک کے باہر اب یہ سب سے زیادہ منظم اور طاقتور جماعت بن چکی تھی۔ چین کے ممتاز تاجر، جو حکومت کی ناجائز مراعات کی وجہ سے بے حد امیر بن چکے تھے، اسے بے تحاشا مالی امداد فراہم کر رہے تھے۔ بہت سے سرکاری محکموں اور بنکوں پر اشتراکیوں اور اشتراکیت نوازوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ پھر اس پارٹی نے فوج میں بھی اچھا خاصا اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا۔ ہوائی فوج کا سربراہ عمر دانی کمیونسٹ پارٹی کا علانیہ بہی خواہ تھا۔ ملک کا وزیرِ خارجہ ڈاکٹر سوباندریو تو بغیر کسی اخفا کے کمیونسٹوں سے براہِ راست تعلق رکھتا تھا۔ بری فوج کے قریب قریب ایک چوتھائی حصے میں اشتراکی جراثیم پوری طرح سرایت کر چکے تھے۔ ملک کے اندر منصوبہ بندی کے مختلف ادارون اور داخلی اور خارجی پالیسی ترتیب دینے والے محکموں پر کمیونسٹ پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ پریس اور نشر و اشاعت کے دوسرے مراکز اشتراکیوں کی تحویل میں آ چکے تھے اور خفیہ پولیس پر

تسلط کی وجہ سے اشتراکی رہنما ملک کی ساری سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھ سکتے تھے۔

حالات کو اپنے موافق پا کر کمیونسٹ پارٹی نے ابتداءً یہ فیصلہ کیا کہ وہ ۱۹۷۰ء میں انڈونیشیا کے اندر اشتراکی انقلاب برپا کر سکتی ہے۔ لیکن صورت حال جس تیزی کے ساتھ اشتراکیت کے حق میں بدل رہی تھی اس نے ان کو یہ کام بڑی عجلت کے ساتھ سر انجام دینے کی ترغیب دی اور یہ طے پایا کہ یہ انقلاب یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ہی لے آنا چاہیے کیونکہ ملک پکے پھل کی طرح اشتراکیت کی گود میں آگرنے کے لیے بالکل تیار ہے۔ چنانچہ اس کے لیے متعدد انتظامات کیے گئے۔ صدر سکارنو کے حفاظتی دستے کی کمان کرنل انتونگ کے سپرد ہوئی تاکہ اگر آخر وقت میں وہ کوئی مزاحمت کرے تو اسے کچل دیا جائے۔ کمیونسٹ نوجوانوں اور عورتوں کی تنظیموں کے ارکان کو جمع کر کے انہیں مضافات کے فوجی اڈے حلیم سے متصلہ علاقہ لوبانگ بوئیہ میں لے آیا گیا اور ظاہر یہ کیا گیا کہ انہیں ملائیشیا پر حملہ کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ اشتراکی لیڈروں نے پورے ملک کا طوفانی دورہ کر کے پارٹی کے ارکان کو خبردار کیا اور کسان محاذ کے کاشتکاروں کو فصلیں تباہ کرنے، چاول و شکر کے ذخائر پر حملہ کر کے انتشار اور دہشت پھیلانے، مزدوروں کی ہڑتالیں کرا کے معاشی زندگی کو درہم برہم کرنے کی ہدایات جاری کی گئیں۔ جن جن بااثر لوگوں سے مخالفت کا خطرہ تھا انہیں اغوا اور قتل کرنے اور اُن کے مکانوں کو آگ لگانے کا ایک جامع منصوبہ تیار کر لیا گیا۔ اور ایک ایسا دہشت پسند گروہ منظم کیا گیا جو قانون کو توڑ کر ملک میں فوراً انارکی پھیلا دے۔ پھر خوبصورت مغنیاؤں کا ایک دستہ بنایا گیا جو اپنے حسن سے متاثر کر کے دوسری جماعتوں کے رہنماؤں کو اشتراکی سلطنت کے اثر میں لے آئے۔

اِدھر یہ تیاریاں ہو رہی تھیں اور اُدھر "باپو" اپنے محل میں دادِ عیش دے رہے تھے۔ انقلاب سے چند گھنٹے پیشتر تک انہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ ملک پر کوئی آفت ٹوٹنے والی ہے۔ اس لیے

کمیونسٹ پارٹی نے اپنے پروگرام اور منصوبے کے تحت راتوں رات ہر وہ قدم اٹھایا جو انقلاب کے لیے درکار تھا۔ فضائیہ کے اشتراکی عناصر نے ریڈیو جکارتہ پر قبضہ کر لیا۔ چھاتہ بردار فوج کی دو بٹالینوں نے صدارتی محل کو گھیرے میں لے لیا۔ ذرائع مواصلات مزدوروں کے قبضے میں آ گئے اور ۴۵ افراد پر مشتمل ایک انقلابی کونسل نے حکومت کا پورا چارج سنبھال لیا۔ فوج کے جن جن جنرلوں سے مخالفت کا خطرہ تھا انہیں یا تو اُن کی جائے رہائش پر گولی مار دی گئی یا کسی دوسرے مقام پر لے جا کر انتہائی وحشیانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دو جنرل جو واجب القتل لوگوں میں سرفہرست تھے بالکل معجزانہ طور پر بچ گئے۔ ایک ناسوشیون اور دوسرے سہارتو انقلاب کی خبر سنتے ہی انہوں نے فوراً فوج کے وفادار عناصر کو اکٹھا کر لیا اور پھر عوام کے تعاون سے انقلابیوں کا تختہ اُلٹ دیا۔ اس کے بعد بلاتاخیر فوج کے کمیونسٹ عناصر کا صفایا کر دیا گیا، اشتراکیت کے حامی ۱۲ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو بند کر دیا گیا اور تمام اشتراکی جرائد اور اخبارات کی اشاعت ممنوع قرار دے دی گئی۔

عوام کو جب اِس شرمناک کھیل کا پتہ چلا اور انہیں اپنے بہترین فوجی جنرلوں کی اذیت ناک موت کی اطلاعات ملیں تو اُن کے سالوں سے گھٹے ہوئے جذبات طوفان کی صورت میں بہ نکلے اور انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے اڈوں اور اس کے رہنماؤں اور کارکنوں پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ یہ قتلِ عام کتنا وحشتناک تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف جزیرۂ بالی میں پچاس ہزار سے اوپر افراد ہلاک ہوئے۔ عوام اپنے جنرلوں کے بہیمانہ قتل اور کسان فرنٹ کی دہشت گردیوں کو یاد کر کر کے سخت مشتعل ہو رہے تھے۔ انہیں رہ رہ کر یہ بات یاد آتی تھی کہ کس طرح یہ لوگ اپنے دورِ اقتدار میں اُن کے گھروں پر حملے کرتے۔ اُن کی بہو بیٹیوں کی عصمت لوٹتے اُن کے مال و دولت پر ڈاکے ڈالتے۔ ان کے مذہب پسند طبقوں پر ظلم و ستم ڈھاتے، مساجد اور کلام اللہ کی بے حرمتی کرتے اور اُن کے اخلاق کو برباد کرنے کے لیے شرمناک حربے استعمال کرتے

تھے۔ یوتھ فرنٹ کے ہیڈکوارٹر پر جن بھیانک جرائم کا ارتکاب ہوتا تھا اُن کا حال بھی اب عوام کو معلوم ہو گیا تھا۔ پھر جب اُن پر یہ راز افشا ہوا کہ اس ناکام انقلاب کا رابطہ پیکنگ سے ہے تو اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ غیظ و غضب میں آ کر چینی حکام اور چینی باشندوں پر بھی پل پڑے۔ اس خفیہ تعلق کا سب سے بڑا ثبوت اُس چینی اسلحہ بارود کی دستیابی تھی جو سرگرم کمیونسٹوں کے قبضے سے برآمد ہوا اور جو تعمیراتی سامان کے بیلوں کے ساتھ انڈونیشیا میں سمگل ہوا تھا۔ پھر ریڈیو پیکنگ نے جو روش اختیار کی اُس نے بھی عوام کے اندر مزید ہیجان اور اشتعال پیدا کیا اور انہوں نے اشتراکیت کا سرزمین انڈونیشیا سے بالکل صفایا کر دینے کا تہیہ کر لیا

سوکارنو نے اس موقع پر بھی اشتراکیت کی حمایت جاری رکھی اور لوگوں کی توجہ اُس طرف سے ہٹانے کے لیے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ صرف وہی اُن کے سارے دکھوں کا مداوا کر سکتا ہے اس لیے انہیں اُس کی ذات پر پورا اعتماد اور بھروسہ کرنا چاہیے۔ مگر لوگوں کے سامنے اب تلخ حقائق اتنے کھل کر آ چکے تھے کہ اُس شخص کی چرب زبانی سے وہ قطعاً متاثر نہ ہوئے اور انہوں نے اُس کی کسی بات پر بھی توجہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ انہیں یہ یقین ہو چکا تھا کہ خود "باپو" اس انقلاب میں ملوّث ہے۔ اشتراکیت کے مقابلے میں طلبہ کے اندر ایک نئی تنظیم "کامی" حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اُبھری اور اُس نے دیکھتے دیکھتے نوجوانوں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ یہ لوگ کمیونسٹ اثرات کو زندگی کے ہر شعبے سے زائل کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ انہوں نے صدر کے طرزِ عمل پر سخت گرفت کی اور اُس کے خلاف مظاہروں میں اس کی ایسی تصاویر دکھائی گئیں جن سے اُس کے قول و فعل کا تضاد نمایاں ہوتا تھا۔ یہ شخص خود تو اپنا سارا وقت عیش و عشرت میں بسر کرتا مگر عوام جب بھوک کا گلہ کرتے تو انہیں یہ نصیحت کرتا کہ ہمیں قومی وقار کے مقابلے میں پیٹ کو سامنے نہ لانا چاہیے، انسان صرف

روٹی پر زندہ نہیں رہتا۔

انڈونیشیا کا مستقبل کیا ہو گا؟ اس کے متعلق ابھی کوئی چیز بھی وثوق اور یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن جو کچھ وہاں ہُوا ہے اُس سے چند حقائق کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان ممالک کی قیادت اور سربراہی جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ فہم و تدبر کے اعتبار سے تہی دست اور خاص طور پر اپنی قوم کے مزاج کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وہ جب تک اس معاملے میں اخلاص اور ذہانت کا ثبوت نہ دیں گے اس وقت تک اس ملت کا مستقبل تاریک رہے گا۔ محض قوت کے بل بوتے پر اس قوم کو کسی باطل نظریۂ حیات کا علمبردار بنا دینا سخت مشکل اور اس کی کوشش کرنا پرلے درجے کی حماقت اور بے وقوفی ہے۔ جس قدر جلدی مسلمان قوموں کے سربراہوں کو اپنی اس غلطی کا احساس ہو جائے اتنا ہی وہ ان کی غریب قوم اور خود اُن کے اپنے حق میں بہتر ہو گا۔

دوسرے، مسلم ممالک کے جو سربراہ اپنے عمل کی کمی کو محض زبان کے جوہر دکھانے اور صرف بلند بانگ دعووں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں بھی یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ زندگی بڑے ٹھوس حقائق سے عبارت ہے۔ کسی قوم کو جھوٹے طلسمات میں زیادہ دیر تک گرفتار نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے عوامی زندگی تلخ ہو گئی ہو تو وہ تلخیاں یقیناً ایک دن اُس کے طرز عمل میں جھلک کر سامنے آئیں گی۔

تیسرے، جبر و استبداد اور ذرائع اظہار رائے پر کنٹرول، عوام کی زبانیں بند کرنے کے لیے وقتی طور پر خواہ کتنا ہی مؤثر ہتھیار رہو مگر یہ تعمیر و ترقی کے لیے کبھی بھی مؤثر اور کارگر حربہ ثابت نہیں ہُوا۔ اس سے کچھ دیر تک انسان تلخ اور ناخوشگوار باتیں سننے سے محفوظ رہتا ہے۔ مگر اس سے عوامی زندگی میں کوئی سکون اور اطمینان پیدا نہیں ہوتا جو کسی برسرِ اقتدار شخص کی شہرت، ناموری اور پائیدار محبت کی ضمانت ہو۔ حقیقی عظمت مفاد پرستوں اور کاسہ

لیسوں یا تنخواہ دار ملازموں کے خوشامدانہ بیانات یا قصیدوں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس ٹھوس اور مفید کام سے حاصل ہوتی ہے جس کی افادیت کو عوام دل کی گہرائیوں سے تسلیم کریں۔



مطبوعات

حیاتِ مسیح علیہ السلام | تالیف: جناب عباس محمود العقاد - ترجمہ: جناب منہاج الدین اسلامی
شائع کردہ: پاکستان کواپریٹو پبلشرز ۲- فیضی سٹریٹ اچھرہ موڑ، لاہور قیمت: ۵ روپے
صفحات: ۲۹۲

اس کتاب میں فاضل مصنف نے تاریخ اور جدید عصری انکشافات کی روشنی میں سیدنا عیسےٰ علیہ السلام کی شخصیت، کردار اور عظمت بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ تالیف ایک خاص دعوے کی تائید میں ہے جس کا ماحصل ان کے الفاظ میں یہ ہے:-

"عظیم الشان نبوتوں نے ہمیشہ ان شہروں کا انتخاب کیا ہے جنھیں قافلوں اور کاروانوں کی گذرگاہ کی حیثیت حاصل تھی اس لیے کہ ان میں جو معاشرہ جنم لیتا تھا اسے حضارت اور بداوت کے بین بین درجہ دیا جا سکتا ہے"۔

پوری کتاب میں اسی دعوے کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے سیرت مسیح علیہ السلام اور سیرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی زاویہ نگاہ سے قلم بند کیا ہے۔ کتاب کا ترجمہ بڑا عمدہ، سلیس اور رواں ہے اور اس میں کسی ایک مقام پر بھی ترجمہ پن محسوس نہیں ہوتا۔

قطع ید اور اسلامی آئیڈیالوجی (بزبان انگریزی) | تالیف: جناب محمد اقبال غازی ایڈووکیٹ، ملنے کا پتہ: ریبن پرنٹنگ پریس بل روڈ لاہور، یا براہ راست مصنف سے
بی ۱۶۲ پت رنگن سٹریٹ بھاٹی گیٹ لاہور۔

اس کتاب کے مصنف ایک مخلص ماہر قانون ہیں۔ انھوں نے اسلامی مشاورتی کونسل کی سزاؤں کے بارے میں سفارشات پر تبصرہ فرمایا ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی سزاؤں کا نفاذ اسی صورت میں مستحسن ہے جب پاکستان میں عملاً اللہ کا دین اپنے پورے مقتضیات کے ساتھ نافذ ہو۔ ان کے نزدیک چوری کا ارتکاب کرنے والوں کو بلاشبہ قطع ید کی سزا دیجائے لیکن اس وقت جب اسلام کا معاشی نظام عوام کی بنیادی ضروریات کا کفیل ہو اور معاشرے میں دولت کی منصفانہ تقسیم ہو۔ اس ضمن میں فاضل مصنف کی تصریحات ملاحظہ ہوں :-

"ہم پر سرمایہ دارانہ نظام اپنی بدترین صورت میں مسلط ہے، یہاں سود کی لعنت موجود ہے مگر زکوٰۃ کی رحمت سے ہم محروم ہیں، ہمارے ہاں کوئی ایسا قانون نہیں جس کی رو سے ایک بے سہارا، کمزور اور مفلوک الحال معاونت حاصل کر سکے۔ یہاں روزگار کی کوئی ضمانت نہیں اور نہ عوام کو ترقی کے ایک جیسے مواقع میسر ہیں پھر انھیں زندگی کی بنیادی ضروریات مثلاً خوراک، لباس، تعلیم اور مفت طبی امداد کے حصول کا قانون کی رو سے کوئی حق نہیں۔"

مصنف کا احساس یہ ہے کہ سزائیں سرمایہ دارانہ نظام کی تقویت کا باعث ہوں گی

جناب غازی صاحب کا نقطۂ نظر صحیح ہے کہ اسلام کو پورے کا پورا اپنانا چاہیے لیکن انھوں نے شاید اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ اس ملک میں ہر چور اس بنا پر چوری نہیں کرتا کہ وہ بنیادی ضروریات سے محروم ہے۔ وہ تبصرہ نگار سے اتفاق فرمائیں گے کہ یہاں بہت سے جرائم کسی مجبوری کی بنا پر نہیں بلکہ محض فیشن کے طور پر کیے جاتے ہیں اور مجرموں کو غیر صحت مند رجحانات اور سزا سے بچ نکلنے کے وافر امکانات یا سزا کے اندر انتہائی نرمی ارتکاب جرم میں جری اور دلیر بنا دیتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے جو معاشرے کے امن وسکون کو خواہ مخواہ بغیر کسی معقول وجہ کے برباد کر رہے ہیں انھیں سخت سے سخت سزائیں ہی باز رکھ سکتی ہیں۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۲۴۰

تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان

(سیاسی کشمکش حصہ اول، دوم و مسئلہ قومیت)

جلد اوّل

تالیف: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- قبل تقسیم مسلمانوں کی سیاسی، اخلاقی اور تمدنی حالت کا نقشہ
- کانگرس کی سیاسی چالوں کا تجزیہ اور بھرپور تنقید
- نیشنلسٹ مسلمانوں کے کردار اور مقام کا تعین
- مسلمانانِ ہند کیلئے صحیح نصب العین اور طریقۂ کار کی نشان دہی
- برصغیر ہند و پاک کی پچاس سالہ ہنگامہ خیز سیاست پر بے لاگ تبصرہ

مولانا مودودی کی سیاسی، دینی اور علمی بصیرت کا شاہکار

ضخامت ۲۲×۱۸/۸ تقریباً ۵۰۰ صفحات — قیمت صرف ۱۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

فون نمبر ۶۸۳۴۱